الرسالہ

سرپرست
مولانا وحیدالدین خاں

روزہ کا مطلب اللہ کیلئے اپنی خواہشوں پر روک لگانا ہے
خواہ روک لگانے کی یہ فہرست
کھانے پینے جیسی ضروری چیزوں تک پہنچ جائے

مئی ۱۹۸۵
شمارہ ۱۰۲

اردو ، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

مئی ۱۹۸۵ □ شمارہ ۱۰۲

قیمت فی پرچہ	۳ روپیہ
زر تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	دو سو روپے
بیرونی ممالک سے :	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

الرسالہ کے لیے بنک سے رقم بھیجتے ہوئے
بنک ڈرافٹ پر صرف الرسالہ منتھلی AL-RISALA MONTHLY لکھیں

ماہنامہ الرسالہ
سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایک گزارش

اسلامی مرکز کی ابتدا ۱۹۷۰ میں ہوئی۔ پچھلے پندرہ سال کے عرصہ سے وہ نہایت خاموشی کے ساتھ دعوت الی اللہ اور تعمیر ملت کے کام میں مصروف ہے۔ اردو اور انگریزی میں ماہنامہ الرسالہ جاری ہے اور ہندی اور دوسری زبانوں میں اس کے اجراء کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ مکتبہ الرسالہ کے تحت کئی درجن کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے ذرائع دعوت کو بھی حسب حالات استعمال کیا جا رہا ہے۔

کام میں اضافہ کے ساتھ بہت سی نئی ضرورتیں بھی سامنے آگئی ہیں۔ مثلاً پرنٹنگ پریس کا قیام دار الترجمہ، تعلیمی و تربیتی درس گاہ، دوسری ملکی زبانوں میں الرسالہ کا اجراء اور کتابوں کی اشاعت، مختلف مقامات پر فارغ کارکن مقرر کرنا وغیرہ۔

موجودہ کام کو چلانے اور دوسرے منصوبوں کو بروئے کار لانے کے لئے کثیر وسائل کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں ہم آپ سے مالی تعاون کی اپیل کرتے ہیں۔

رقم بھیجتے وقت یہ ضرور صراحت فرما دیں کہ وہ کس مد کی رقم ہے۔

وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۳

خدا سے ڈرو

قرآن ، جیسا کہ معلوم ہے ، ۲۳ سال میں تھوڑا تھوڑا کرکے اترا ۔ اس کا آغاز اقرأ (پڑھ) سے ہوا ۔ پیغمبر کے واسطہ سے خدا انسان کو پڑھاتا رہا ۔ وہ انسان کو اس کی زندگی کی تعمیر کے بارہ میں وہ تمام باتیں بتاتا رہا جس کو وہ خود سے نہیں جان سکتا تھا ۔

اس طرح خدا کتاب ہدایت کے اجزاء بھیجتا رہا ۔ یہاں تک کہ خدائی منصوبہ کے مطابق جب کتاب پوری ہو گئی تو اس کی آخری آیت اتری ۔ یہ ایک لمبی آیت ہے جو موجودہ قرآن میں سورہ مائدہ کی تیسری آیت کے طور پر شامل ہے ۔ اس آیت کا ایک حصہ یہ ہے :

الیوم یئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشوھم واخشون الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا (المائدہ ۳)	آج منکرین تمہارے دین سے ناامید ہو گئے ، پس ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو ۔ آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تمہارے اوپر اپنے انعام کو پورا کر دیا ۔

اس آیت سے مسلمانوں نے اپنے لئے فخر کی غذا تو بہت لی ہے مگر اس سے انھوں نے سبق کی غذا نہیں لی ۔ ہر مسلمان آپ کو یہ فخر کرتا ہوا ملے گا کہ ہمارا دین کامل ہے ۔ مگر ایسے لوگ آپ کو نہیں ملیں گے جو اس سے اس سبق کو لینے کی کوشش کریں جو اس آیت میں ہمارے لئے رکھ دیا گیا ہے ۔

"تم اب لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ صرف خدا سے ڈرو" اس سے یہ متعین ہو رہا ہے کہ مسائل میں مسلمانوں کے سوچنے کا انداز کیا ہونا چاہئے ۔ وہ یہ ہونا چاہئے کہ مسلمان اپنے مسائل و مشکلات میں انسان کی طرف نہ دیکھیں بلکہ خدا کی طرف دیکھیں ۔

انسانوں کی طرف سے معاملہ پیش آئے تب بھی وہ خدا کی طرف متوجہ ہو جائیں ۔ وہ خدا کے ساتھ اپنے معاملہ کو درست کرکے سمجھیں کہ انسانوں کے ساتھ بھی ان کا معاملہ درست ہو جائے گا ۔

پیغمبر اسلام کا لایا ہوا دین چونکہ آخری دین ہے ، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو اس حد تک محفوظ اور مستحکم کر دیا ہے کہ کوئی اس کا کچھ بگاڑ نہ سکے ۔ مسلمان اگر اپنے دین پر قائم ہوں تو یہی ان کے استحکام کی یقینی ضمانت بن جائے ۔

محرومی

فرانس میں سحر و نجوم تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ۱۹۸۴ میں فرانس کے جن شہریوں نے ساحروں اور جوتشیوں سے رجوع کیا ان کی تعداد تقریباً آٹھ ملین ہے۔ یعنی فرانس کے ہر چار آدمیوں میں سے ایک آدمی۔

فرانس میں جوتش اور غیب دانی باقاعدہ تجارتی پیشہ بن گئے ہیں۔ چنانچہ ٹیکس کے محکمہ کے مطابق پچاس ہزار افراد باقاعدہ محکمہ ٹیکس میں اس اعتبار سے رجسٹرڈ ہیں۔ یہ تعداد فرانس میں پادریوں یا ڈاکٹروں کی تعداد سے زیادہ ہے۔ ان لوگوں کی آمدنی ۵۰۰ ملین سے لے کر ۶۰۰ ملین ڈالر سالانہ تک ہوتی ہے۔

اے ایف پی نے پیرس سے رپورٹ دیتے ہوئے کہا ہے کہ:

With the deepening economic recession, more and more people are turning to the occult for relief for their physical and psychological ailments.

گہرے اقتصادی بحران کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ لوگ اپنی جسمانی اور نفسیاتی بیماریوں کے لئے غیب دانوں سے رجوع کر رہے ہیں (ٹائمس آف انڈیا ۵ مارچ ۱۹۸۵)

انسان کو بار بار یہ تجربہ ہوتا ہے کہ ظاہری مادی اسباب اس کا سہارا بننے کے لئے ناکافی ہیں۔ وہ معلوم اسباب سے مایوس ہو کر نامعلوم اسباب کی طرف دوڑتا ہے۔ مگر نامعلوم اسباب کی تلاش میں کسی انسان کا سہارا پکڑنا سراسر بے حقیقت ہے۔ یہ ایسی چیز کا سہارا پکڑنا ہے جس کے اندر سہارا بننے کی طاقت نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کا سہارا صرف ایک ہے۔ اور وہ خدا ہے۔ مادی اسباب کی بے مائگی اس لئے تھی کہ آدمی خدا کی طرف رجوع کرے۔ مگر مادی اسباب کے عجز کا تجربہ اس کو ایک اور عاجز کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ حقیقت کا سراغ پانے کے بعد آدمی دوبارہ حقیقت کو کھو دیتا ہے۔

غیر حقیقی اضافہ

ایک مغربی ملک کے ایک ادارہ نے ایک اشتہار شائع کیا۔ اس کو ایک خاتون کارکن کی ضرورت تھی۔ ادارہ کو خاتون کے اندر جو مختلف صفات درکار تھیں ان میں سے ایک صفت اس کا خاص اور متعین قد بھی تھا۔

اشتہار کی اشاعت کے بعد ادارہ کے پاس بہت سی درخواستیں آئیں۔ جانچ ہوئی تو ایک خاتون تمام مطلوبہ اوصاف میں غیر معمولی طور پر پوری ہوتی چلی گئی۔ تاہم قد کے معاملہ میں وہ نامنظور کر دی گئی اس کا قد مطلوبہ لمبائی سے آدھ انچ کم تھا جس کو اس نے اپنے جوتے کی ہیل میں آدھ انچ اونچائی کا اضافہ کر کے پورا کیا تھا۔ ججوں نے لکھا:

غیر نارمل ہونا ہر حال میں ناقابل قبول ہے۔ خواہ وہ قد کے آدھ انچ کم ہونے میں ہو یا ہیل کے آدھ انچ زیادہ ہونے میں۔

یہ چھوٹا سا واقعہ زندگی کے ایک قانون کو بتاتا ہے۔ یہ قانون کہ غیر حقیقی چیز میں اضافہ حقیقی چیز میں کمی کا بدل نہیں ہے۔ اگر آپ کا اپنا "جسم" چھوٹا ہے تو "اسٹیج" کو اونچا کر کے آپ کبھی بلندی کا مقام حاصل نہیں کر سکتے۔

جب بھی آدمی زندگی کی دوڑ میں پیچھے ہو جائے تو اس کی وجہ ہمیشہ اپنی کوئی کمی ہوگی۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ اس کمی کو جانے۔ وہ اپنی ساری توجہ اپنی کمی کو دفع کرنے میں لگا دے۔ اپنی کمی کو دور کر کے دوبارہ آدمی اپنے کھوئے ہوئے مقام کو حاصل کر سکتا ہے۔ مگر دوسری باتوں پر ہنگامہ کھڑا کر کے وہ صرف وقت کو ضائع کرتا رہے گا۔

اگر آپ کارکردگی میں کم ہوں تو مطالبات میں اضافہ سے آپ اس کی تلافی نہیں کر سکتے۔ اگر آپ منصوبہ بندی میں کم ہوں تو شور و غل میں زیادتی سے آپ اس کی تلافی نہیں کر سکتے۔ اگر آپ معنویت میں کم ہوں تو آپ الفاظ میں اضافہ سے اس کی تلافی نہیں کر سکتے۔ اگر آپ مقابلہ کی دوڑ میں پیچھے ہو گئے ہوں تو احتجاج اور شکایت میں اضافہ سے آپ زندگی کی اگلی صفوں میں جگہ نہیں پا سکتے۔

ایک حقیقی کمی صرف حقیقی چیز سے پوری ہو سکتی ہے نہ کہ کسی غیر حقیقی اور غیر متعلق چیز سے۔

بائبل کی زبان سے

رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ درخت کاٹ ڈالو اور یروشلم کے مقابل دمدمہ باندھو۔ یہ شہر سزا کا سزاوار ہے۔ اس میں ظلم ہی ظلم ہے۔ جس طرح پانی چشمہ سے پھوٹ نکلتا ہے اسی طرح شرارت اس سے جاری ہے۔ ظلم اور ستم کی صدا اس میں سنی جاتی ہے۔ اے یروشلم تربیت پذیر ہو، تا نہ ہو کہ میرا دل تجھ سے ہٹ جائے۔ نہ ہو کہ میں تجھے ویران اور غیر آباد زمین بنا دوں۔

رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ دیکھ، ان کے کان نامختون ہیں۔ اور وہ سن نہیں سکتے۔ دیکھ خداوند کا کلام ان کے لئے حقارت کا باعث ہے۔ وہ اس سے خوش نہیں ہوتے۔ اس لئے میں خداوند کے قہر سے لبریز ہوں۔ ان کے گھر کھیتوں اور بیویوں سمیت اوروں کے ہو جائیں گے کیونکہ خداوند فرماتا ہے میں اپنا ہاتھ اس ملک کے باشندوں پر بڑھاؤں گا۔ اس لئے کہ چھوٹوں سے بڑوں تک سب کے سب لالچی ہیں۔ اور نبی سے کاہن تک ہر ایک دغا باز ہے۔ کیوں کہ وہ میرے لوگوں کے زخم کو یوں ہی سلامتی سلامتی کہہ کر اچھا کرتے ہیں حالاں کہ سلامتی نہیں ہے۔

خداوند یوں فرماتا ہے کہ راستوں پر کھڑے ہو اور دیکھو اور پرانے راستوں کی بابت پوچھو کہ اچھی راہ کہاں ہے۔ اسی پر چلو اور تمہاری جان راحت پائے گی۔ پر انھوں نے کہا کہ ہم اس پر نہ چلیں گے۔

اس سے کیا فائدہ کہ سبا سے لوبان اور دور کے ملک سے اگر میرے حضور لاتے ہیں۔ تمہاری سوختنی قربانیاں مجھے پسند نہیں۔ اور تمہارے ذبیحوں سے مجھے خوشی نہیں۔ اس لئے خداوند یوں فرماتا ہے کہ دیکھ میں ٹھوکر کھلانے والی چیزیں ان لوگوں کی راہ میں رکھ دوں گا۔ اور باپ اور بیٹے باہم ان سے ٹھوکر کھائیں گے۔ ہمسایہ اور ان کے دوست ہلاک ہوں گے۔ میدان میں نہ نکلنا اور سڑک پر نہ جانا، کیوں کہ ہر طرف دشمن کی تلوار کا خوف ہے۔

وہ سب کے سب نہایت سرکش ہیں۔ وہ غیبت کرتے ہیں۔ وہ تو تانبہ اور لوہا ہیں۔ وہ سب کے سب معاملہ کے کھوٹے ہیں۔ دھونکنی جل گئی۔ سیسہ آگ سے بھسم ہوگیا۔

وہ مردود چاندی کہلائیں گے، کیوں کہ خداوند نے ان کو رد کر دیا ہے۔

(یرمیاہ، باب ۶)

بتائے بغیر

ایک انگریزی کتاب میں ایک دلچسپ واقعہ پڑھا۔ اس کے الفاظ یہ تھے :

When Sir Charles Napier conquered Sind in 1843, his victory message to the Governor-General, Lord Dalhousie, read "Peccavi" which in Latin means, "I have sinned."

انگریز جنرل سر چارلس نیپیر نے جب ۱۸۴۳ء میں سندھ کو فتح کیا تو اس نے اس وقت کے ہندستانی گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی کو فتح کا پیغام ان لفظوں میں بھیجا "پیکاوی" یہ لاتینی لفظ ہے جس کے معنی ہوتے ہیں "میں نے گناہ کیا"

بظاہر یہ بڑا عجیب پیغام تھا۔ فوجی افسر اور گورنر جنرل میں پہلے سے ایسی کوئی قرارداد نہیں ہوئی تھی جس کے مطابق وہ اس کا مطلب جان لیتا۔ اس کے باوجود گورنر جنرل اس کو سمجھ گیا۔ اس نے پیکاوی کا انگریزی ترجمہ کاغذ پر لکھا تو وہ اس طرح تھا I have sinned اس کو دیکھ کر وہ فوراً سمجھ گیا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ میں نے سند کو سر کر لیا۔

نازک اور بڑے معاملات میں عہدہ برآ ہونے کے لئے ہمیشہ ایسے ہی ذہین اور دوررس افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی ایسے لوگ جو اشاروں کے ذریعے تفصیل کو سمجھ لیں۔ جو نہ کہی ہوئی بات کو کہی ہوئی بات کی طرح جان لیں۔ جو اس بات کو پڑھ لیں جو سطروں میں لکھی ہوئی موجود نہیں ہے۔ اور نہ کبھی موجود ہو سکتی۔

زندگی کی حقیقتوں میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ ہر بات پیشگی بتائی نہیں جا سکتی۔ بہت سی باتوں کو بتائے بغیر جاننا پڑتا ہے۔ جن لوگوں کے اندر یہ صلاحیت ہو وہی کوئی قابل ذکر کام کرتے ہیں۔ اور جو لوگ اس صلاحیت سے محروم ہوں وہ صرف نادانیاں کریں گے اور اس کے بعد شکایتوں کا دفتر لے کر بیٹھ جائیں گے۔

دنیا میں سب سے زیادہ خوش قسمت انسان وہ ہے جس کو ایسے ساتھی مل جائیں جو چپ کی زبان جانتے ہوں۔ جو بولے بغیر سنیں اور لکھے بغیر پڑھیں۔ جو سطروں سے گزر کر بین السطور میں چھپی ہوئی باتوں کو جان لیں۔

زیادہ قیمت

ابوجہل کے لڑکے عکرمہ ابتداءً اپنے باپ کے ساتھ تھے۔ مگر فتح مکہ کے بعد انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ مدینہ آئے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ان کا مختصر سوال وجواب ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے کلمہ شہادت کا اقرار کرلیا۔ قبول اسلام کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے عکرمہ سے کہا کہ آج تم جو کچھ بھی مجھ سے مانگوگے وہ میں تمھیں دوں گا۔ عکرمہ نے کہا کہ میں آپ سے صرف یہ مانگتا ہوں کہ میں نے آپ کے ساتھ جو بھی دشمنی کی ہو۔ یا جو قدم بھی آپ کے خلاف اٹھایا ہو۔ یا جو بھی جنگ آپ سے کی ہو۔ یا جو مخالفانہ بات بھی آپ کے سامنے یا آپ کے پیچھے کہی ہو ان سب کو آپ معاف فرمادیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر فوراً خدا کی طرف متوجہ ہوگئے۔ آپ نے فرمایا اے اللہ، تو عکرمہ کو ہر اس دشمنی کے لئے بخش دے جو انھوں نے میرے خلاف کی ہو۔ ان کے ہر اس اقدام کے لئے ان سے درگزر فرما جو انھوں نے تیرے نور کو بجھانے کے لئے کیا ہو۔ اور انھوں نے میرے سامنے یا میرے پیچھے جو کچھ مجھے برا کہا ہو اس کو معاف فرما۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اس دعا کے بعد عکرمہ نے کہا:

اما و اللہ یا رسول اللہ لا ادع نفقة كنت انفقتها في الصد عن سبيل الله الا انفقت ضعفها في سبيل الله ولا قاتلت قتالاً في الصد عن سبيل الله الا ابليت ضعفه في سبيل الله (کنز العمال)

خدا کی قسم اے اللہ کے رسول، میں خدا کے راستہ سے روکنے کے لئے جتنا خرچ کرتا تھا اس کا دگنا اب خدا کے راستہ میں خرچ کئے بغیر نہ رہوں گا۔ میں خدا کے راستہ سے روکنے کے لئے جتنا لڑتا تھا اس کا دگنا اب میں خدا کے راستہ میں لڑوں گا۔

حضرت عکرمہ اپنے اس قول پر پوری طرح قائم رہے۔ انھوں نے اپنے وقت اور اپنے مال اور اپنی جان کو پہلے سے بھی زیادہ مقدار میں اللہ کے راستہ میں لگادیا۔ وہ اسلام کے لئے جہاد کرتے رہے۔ یہاں تک کہ طبری کی روایت کے مطابق یرموک کی جنگ میں شہید ہوکر اس دنیا سے چلے گئے۔

اسلامی دعوت کا ایک دور "فتح" سے پہلے ہوتا ہے اور دوسرا فتح کے بعد۔ پہلا عدم استحکام کا دور ہے اور دوسرا استحکام کا دور۔ جو لوگ دوسرے دور میں اسلامی دعوت کا ساتھ دیں ان کے لئے دور اول کے لوگوں کا درجہ حاصل کرنے کی ایک ہی صورت ہے۔ یہ کہ وہ اسلام کے لئے اس سے بھی زیادہ قربانیاں دیں جتنی قربانیاں وہ اس سے پہلے غیر اسلام کے لئے دے رہے تھے۔

دو قسم کے لیڈر

ہندستان کے مشہور قانون داں مسٹر نانی پالکی والا نے لکھا ہے کہ ہندستان کی مصیبت یہ ہے کہ یہاں سیاسی لیڈروں کی بھرمار ہے۔ اور سیاسی مدبرین کی کمی:

The bane of India is the plethora of politicians
and the paucity of statesmen.
Nani Palkhivala in *WE THE PEOPLE*

سیاسی لیڈر (پالی ٹیشین) اور سیاسی مدبر (اسٹیٹس مین) میں کیا فرق ہے، اس کا جواب ہندستان کے نائب صدر جمہوریہ مسٹر ونکٹا رمن نے حسب ذیل الفاظ میں دیا ہے:

A politician thinks of the next election while
a statesman thinks of the next generation.

یعنی ایک سیاسی لیڈر اگلے الکشن کے بارہ میں سوچتا ہے جب کہ ایک سیاسی مدبر اگلی نسل کے بارہ میں سوچتا ہے (ٹائمس آف انڈیا، ۱۷ ستمبر ۱۹۸۴) اس بات کو دوسرے لفظوں میں کہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ رہنما دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک سچا رہنما دوسرا جھوٹا رہنما۔ سچا رہنما قوم کے مفاد میں سوچتا ہے اور جھوٹا رہنما اپنی قیادت کے مفاد میں۔ سچے رہنما کو قوم کے مستقبل کی فکر ہوتی ہے۔ اور جھوٹے رہنما کو اپنے ذاتی مستقبل کی۔

جھوٹا رہنما ایک روایت کو توڑ کر کامیابی حاصل کر سکتا ہو تو وہ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر روایت کو توڑ ڈالے گا اور پھر ذاتی کامیابی حاصل کر کے خوشی کا جشن منائے گا، مگر سچا رہنما ایسے موقع پر رک جائے گا، وہ سوچے گا کہ ایک روایت کو توڑنا بہت آسان ہے مگر دوبارہ ایک مفید روایت قائم کرنا انتہائی مشکل ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ روایت کو باقی رکھا جائے خواہ اس کی وجہ سے ذاتی نقصان اٹھانا پڑے۔

جھوٹا رہنما اگر دیکھے گا کہ ایک جذباتی نعرہ لگا کر وہ کامیاب ہو سکتا ہے تو وہ فوراً اپنی کامیابی کے لئے جذباتی نعرہ لگا دے گا۔ مگر سچا رہنما ایسے موقع پر رک جائے گا، وہ سوچے گا کہ جذباتی نعرہ لگانا دوسرے لفظوں میں قوم کو جذباتی راہوں پر دوڑانا ہے۔ اس لئے قوم کو جذباتی خندق میں گرانے سے بہتر ہے کہ اپنے لئے سیاسی موت کو برداشت کر لیا جائے۔ لیڈر کی موت میں قوم کی زندگی ہے۔ خوش قسمت ہے وہ قوم جس کو ایسے باحوصلہ لیڈر مل جائیں۔

غلط فہمی

مفسر ابن کثیر نے سورہ بنی اسرائیل کی آخری آیتوں کے ذیل میں ایک روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے :

ان رجلاً من المشرکین سمع النبی صلے اللہ علیہ وسلم وھو یقول فی سجودہ: یا رحمٰن یا رحیم فقال انہ یزعم انہ یدعو واحداً وھو یدعوا اثنین

مشرکین میں سے ایک شخص نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو سنا۔ آپ سجدہ میں کہہ رہے تھے کہ اے رحمٰن اے رحیم۔ مشرک نے یہ سن کر کہا کہ یہ شخص سمجھتا ہے کہ وہ ایک خدا کی دعوت دینے والا ہے حالانکہ وہ دو خداؤں پکار رہا ہے۔

یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح بہت سی شکایتیں اور اعتراضات محض آدمی کی اپنی کم فہمی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک خدا کو اس کی کئی صفتوں کے ساتھ پکار رہے تھے کیونکہ خدا اگرچہ ایک ہے مگر اس کی صفتیں بے شمار ہیں۔ مگر مذکورہ اعرابی نے صفات میں تعدد کو وجود میں تعدد کے ہم معنیٰ سمجھ لیا اور اس طرح ایک موحد انسان کے بارہ میں غلط طور پر یہ رائے قائم کر لی کہ وہ بھی اسی کی طرح مشرک ہے۔

انسان ایک بے حد پیچیدہ مخلوق ہے۔ اس کی زندگی کے لاتعداد پہلو ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے بارہ میں رائے قائم کرنا بے حد دشوار کام ہوتا ہے۔ اس میں ۹۰ فی صد سے زیادہ غلط فہمی کا امکان ہے۔ اس لئے آدمی کو چاہئے کہ دوسرے شخص کے بارہ میں رائے قائم کرنے میں وہ نہایت محتاط ہو۔ خوش گمانی قائم کرنے میں آدمی اگر غیر محتاط ہو تو کوئی حرج نہیں۔ مگر بدگمانی قائم کرنا ہو تو آدمی کے لئے لازم ہے کہ وہ بے حد سنجیدہ ہو، وہ آخری حد تک احتیاط سے کام لے۔

ہر آدمی کو جاننا چاہئے کہ وہ جو کچھ رائے قائم کرتا ہے اپنی معلومات کے دائرہ میں کرتا ہے۔ اب چونکہ حقائق کا دائرہ کسی شخص کی ذاتی معلومات سے بہت زیادہ وسیع ہے، اس لئے ہر وقت یہ امکان ہے کہ اپنی معلومات کے دائرہ میں وہ ایک رائے کو صحیح سمجھ لے۔ حالانکہ وسیع تر حقائق کے اعتبار سے اس کی رائے صحیح نہ ہو۔ اس لئے آدمی کو چاہئے کہ جب دوسرے کے بارہ میں رائے قائم کرنا ہو تو خوش گمانی کے معاملہ میں وہ حد درجہ فیاض بن جائے اور بدگمانی کے معاملہ میں حد درجہ بخیل۔ یہی عقل کا تقاضا بھی ہے اور یہی خدا کے خوف کا تقاضا بھی۔

قدردانی

یحکی فی کتب السیر والتاریخ ان ابا موسیٰ الاشعری عاقب جندیا فی جیش العراق فحلق شعر راسه فجمع الجندی الشعر وسافر به من العراق الی المدینة بالحجاز ودخل علی امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنه فقذف بالشعر امامه وقال فی غضب ھکذا یعاملنا رجالك فتھلل وجه عمر وقال: لان یکون الناس کلھم فی مثل شجاعة ھذا احب الیّ من کل ما فتحنا من بلاد (ابن خلدون)

سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں آیا ہے کہ ابوموسیٰ اشعری نے عراق کی فوج میں ایک مسلمان سپاہی کو تنبیہ کی اور اس کے سر کا بال مونڈ دیا۔ سپاہی نے بال جمع کئے اور اس کو لے کر عراق سے مدینہ آیا۔ وہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہاں پہنچا۔ اس نے اپنے بال ان کے آگے ڈال دئے اور غصہ سے کہا کہ تمہارے آدمی ہمارے ساتھ اس طرح کا معاملہ کرتے ہیں۔ حضرت عمر کا چہرہ چمک اٹھا۔ انھوں نے کہا کہ اگر تمام لوگ بہادری میں اس آدمی کی طرح ہو جائیں تو یہ مجھ کو ان تمام ملکوں سے زیادہ محبوب ہے جو ہم نے فتح کئے ہیں۔

مذکورہ فوجی آدمی کے عمل کا ایک رخ یہ تھا کہ اس نے خلیفۂ وقت پر تنقید کی۔ وہ تنقید میں بدتمیزی کی حد تک پہنچ گیا۔ اس کا دوسرا رخ یہ تھا کہ اس نے حد درجہ بہادری اور جرأت کا ثبوت دیا۔ حضرت عمر نے پہلے رخ کو نظر انداز کر دیا۔ اور دوسرے رخ کی بنا پر اس کی تعریف کی۔

مذکورہ فوجی کی بات سن کر اگر حضرت عمر کو غصہ آجاتا تو وہ اس کو سزا دیتے۔ اس کو گرفتار کرکے جیل میں بند کر دیتے۔ یا کم از کم اس کو معتوب کرکے دور بھگا دیتے۔ ایسی صورت میں وہ اپنے دل کی تسکین تو ضرور حاصل کرتے مگر یہ شخصی تسکین اس قیمت پر ہوتی کہ وہ ایک ایسے بہادر شخص کو کھو دیتے جو اسلام کے محاذ پر زبردست کام انجام دینے والا تھا۔

ایک جاندار آدمی تمام قیمتی چیزوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ مگر جاندار آدمی ہمیشہ جری ہوتا ہے۔ وہ خوشامدانہ باتیں کرنا نہیں جانتا۔ جاندار آدمی کو اپنا ساتھی وہی شخص بنا سکتا ہے جو اس کی تنقیدوں اور اس کی جرأت مندانہ باتوں کے باوجود اس کی قدر کر سکے۔ جو اس کو اس کے اندر کے لحاظ سے دیکھے نہ کہ اس کے باہر کے لحاظ سے۔

تین قسم

مستدرک حاکم (کتاب الجہاد) میں حضرت ابوہریرہ سے ایک روایت حسب ذیل الفاظ میں آئی ہے:

کل شئ من لھو الدنیا باطل الا ثلاثۃ انتضالک بقوسک وتادیبک لفرسک وملاعبتک لاھلک فانھن من الحق۔

دنیا کا ہر کھیل باطل ہے سوا تین چیزوں کے۔ تمہارا تیر کمان سے کھیلنا۔ اور تمہارا اپنے گھوڑے کو سدھانا اور تمہارا اپنی بیوی کے ساتھ تفریح کرنا۔ یہ تین کھیل ہیں جو درست ہیں۔

یہ اور اس طرح کی دوسری حدیثوں کو جو لوگ مطلق معنوں میں لے لیتے ہیں وہ ان کو سمجھ نہیں پاتے اور مختلف قسم کی غلطیاں کرتے ہیں۔ مثلاً ایک گروہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ مذکورہ تین چیزوں کے سوا ہر کھیل شریعت میں ممنوع ہے۔ حتیٰ کہ ہاکی اور فٹ بال کھیلنا بھی شیطانی فعل ہے۔

دوسرا گروہ جس کو یہ ناقابل فہم معلوم ہوتا ہے کہ خدا مذکورہ تین چیزوں کے سوا ہر کھیل کو قابل ترک قرار دے وہ جھنجھلا کر خود حدیث ہی کو ترک کر دیتے ہیں۔ وہ کہہ دیتے ہیں حدیث میں پیغمبر کے اقوال صحیح طور پر نقل نہیں ہوئے ہیں۔ اس لئے ہم قرآن کو مانیں گے اور حدیث کو چھوڑ دیں گے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی حدیثیں مطلق معنوں میں نہیں ہوتیں۔ وہ کسی مخصوص صورت حال میں دین کی روح کو بتانے کے لئے ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مذکورہ حدیث میں تین کھیل سے مراد تین قسم کے کھیل ہیں۔ وہ حقیقۃً کھیل کی نوعیت کو بتاتے ہیں نہ کہ کھیل کی صورت کو۔ مفہوم کے اعتبار سے اگر اس حدیث کی تشریح کی جائے تو وہ یہ ہوگی کہ —— دنیا کا ہر کھیل باطل ہے الا یہ کہ وہ بامقصد کھیل ہو۔ مثلاً مقابلہ کی تیاری والا کھیل جیسے کہ قدیم زمانہ میں تیر کمان تھا۔ گھوڑا دوڑانا جس میں جسمانی ورزش بھی ہے اور گھوڑے کو سواری کے لئے تیار کرنا بھی۔ اسی طرح بیوی سے تفریح جو در اصل ناجائز تفریح سے اپنے کو بچانے کا ذریعہ ہے۔

مذکورہ حدیث کو "تین کھیل" کے مفہوم میں لیا جائے تو وہ عجیب معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس کو "تین قسم کے کھیل" کے مفہوم میں لیں تو وہ نہایت بامعنی معلوم ہونے لگتی ہے۔ ایک چیز ظاہر میں کچھ نظر آتی ہے لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو وہ کچھ اور بن جاتی ہے۔

فطری سادگی

صحیح روایات کے مطابق نبوت کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک حج ادا کیا۔ یہ وہی حج ہے جس کو عام طور پر حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ یہ حج آپ نے اپنی وفات سے چند ماہ پہلے ۱۰ھ میں ادا فرمایا۔

حجۃ الوداع کے بارے میں بہت تفصیلی روایات آئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ طواف کے بعد آپ نے صفا اور مروہ نامی پہاڑیوں کے درمیان سعی کی۔ اس سعی کا آغاز آپ نے صفا سے کیا۔ اس وقت آپ کی زبان سے یہ کلمہ نکلا: ان الصفا و المروۃ من شعائر اللہ۔ ابدأ بما بدء اللہ بہ (بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ میں اس سے شروع کرتا ہوں جس سے اللہ نے شروع فرمایا)

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی آیت میں جہاں صفا اور مروہ کا لفظ ہے وہاں جملہ میں صفا کا لفظ پہلے ہے اور مروہ کا لفظ اس کے بعد۔ اسی ترتیب کو آپ نے سعی میں بھی اختیار کیا۔ یعنی قرآن کی آیت چوں کہ صفا سے شروع ہوتی تھی اس لئے آپ نے بھی اپنی سعی صفا سے شروع فرمائی۔ صفا سے چل کر آپ مروہ کی طرف گئے۔

یہ بظاہر ایک چھوٹا سا واقعہ ہے مگر اس میں بہت بڑا سبق ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سادگی کو پسند کرتا ہے۔ اگر آپ مروہ سے اپنی سعی کا آغاز کرتے تو آدمی کو غیر ضروری طور پر صفا اور مروہ کے بارہ میں دو ترتیب یاد رکھنی پڑتی۔ ایک قرآن کی آیت میں ان الفاظ کی ترتیب، دوسری حج کی سعی میں ان کی ترتیب۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دونوں جگہ ایک ہی ترتیب جاری کرکے لوگوں کو غیر ضروری تکلف سے بچا لیا۔

یہ اسلام کی ایک روح ہے جس کو ہمیں ہر معاملہ میں پیش نظر رکھنا چاہئے۔

اسلام ایک سادہ مذہب ہے۔ وہ ہر قسم کی پیچیدگیوں اور غیر ضروری تکلفات سے پاک ہے۔ اسلام میں روح پر زور دیا گیا ہے اور ظواہر کو ثانوی درجہ میں رکھا گیا ہے۔ اسلام میں اساسی باتوں اور جزئی باتوں میں فرق کیا گیا ہے، اساسی باتوں کو اساسی اہمیت دی گئی ہے اور ضمنی باتوں کو ضمنی اہمیت۔ اسلام کو سادہ حقیقتوں پر قائم کیا گیا ہے نہ کہ عقلی بحثوں اور منطقی موشگافیوں پر۔ اسلام کو اختیار کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا ہوا اور پانی کو اختیار کرنا۔

ظاہر اور باطن

قال الشعبی کنت جالساً عند شریح القاضی۔ اذ دخلت امرأۃ تبکی وتشتکی زوجھا وھو غائب وتاثرت لبکائھا وقلت للقاضی اصلحک اللہ ماارھا الا مظلومۃ ماخوذا حقھا۔ فقال وما علمک۔ قلت لشدۃ بکائھا وکثرۃ دموعھا۔ قال لا تحکم الا بعد ان تتبین الامر۔ فان اخوۃ یوسف جاؤا اباھم عشاء یبکون وھم لہ ظالمون۔

امام شعبی کہتے ہیں کہ میں قاضی شریح کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک عورت آئی جو کہ رو رہی تھی اور اپنے شوہر کی شکایت کر رہی تھی اور شوہر وہاں موجود نہ تھا۔ میں اس کے رونے سے متاثر ہوگیا اور قاضی شریح سے کہا کہ اللہ آپ کی مدد کرے، میرا خیال ہے کہ یہ ضرور مظلوم ہے اور اس کا حق چھینا گیا ہے۔ قاضی شریح نے کہا کہ آپ نے کیسے جانا۔ میں نے کہا کہ اس کے رونے کی شدت اور اس کے آنسوؤں کی کثرت کی وجہ سے۔ قاضی شریح نے کہا کہ کوئی حکم نہ لگاؤ جب تک معاملہ واضح نہ ہوجائے کیوں کہ قرآن میں ہے کہ حضرت یوسف کے بھائی اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے آئے حالانکہ وہ خود ظالم تھے۔

•

بے شمار تجربات بتاتے ہیں کہ ظاہر پر باطن کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ظاہر میں خوش اخلاق دکھائی دیتا ہے مگر جب کوئی حقیقی معاملہ پڑتا ہے تو وہ اخلاق سے خالی ثابت ہوتا ہے۔ ایک شخص ظاہری طور پر درست معلوم ہوتا ہے لیکن گہرائی میں جاکر تحقیق کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ درست آدمی نہ تھا۔

ظاہر و باطن کا یہ فرق یہاں تک جاسکتا ہے کہ آدمی کی آنکھیں روئیں حالاں کہ اس کا دل نہ رو رہا ہو۔ وہ زبان سے ہمدردی کے کلمات کہے حالاں کہ اس کے سینہ میں ہمدردی کا کوئی شائبہ موجود نہ ہو۔ وہ بظاہر ایک اچھا آدمی دکھائی دے حالاں کہ اندر سے وہ ایک برا آدمی ہو۔ وہ لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو مظلوم بتائے حالانکہ خدا کی نظر میں وہ خود سب سے بڑا ظالم ہو۔ عقلمند وہ ہے جو آدمی کو اس کے اندر سے دیکھ سکے نہ کہ صرف اس کے ظاہر سے۔

اپنی پہچان

ہر انسان خدا کی ایک منصوبہ بندی ہے۔ ہر انسان کی پیدائش انسان اور اس کے خدا کے درمیان ایک خاموش عہد ہے۔ اسی عہد میں انسان کی ساری قیمت چھپی ہوئی ہے۔

ہر انسان کو خدا نے کچھ خاص صلاحیتیں دی ہیں اور ہر آدمی نے خاموش زبان میں یہ اقرار کیا ہے کہ وہ دنیا میں اس خاص کام کو انجام دے گا جس کے لئے اس کے خدا نے اس کو پیدا کیا تھا۔ اور جس کے مطابق اسے خصوصی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ جو انسان ایسا کرے اس نے گویا خدا کے نقشہ تخلیق میں اپنی جگہ حاصل کی۔ جو شخص ایسا نہ کرے وہ خدا کے نقشہ تخلیق میں اپنی جگہ حاصل کرنے میں ناکام رہا۔

اس بات کو یہاں اصحاب رسول کی مثال سے واضح کیا جاتا ہے۔

صحابہ کرام میں ایک حضرت ابوہریرہ تھے اور دوسرے خالد بن الولید۔ حضرت ابوہریرہ کی روایات کی تعداد ۵۳۷۴ تک شمار کی گئی ہے۔ جب کہ حضرت خالد کی روایات کی تعداد ایک سو سے بھی کم ہے۔ یہ فرق بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس فرق کی وجہ خدمت اسلام کے میدان کا فرق تھا نہ کہ خود اسلام کا۔

حضرت ابوہریرہ بھی ایک مخلص مسلمان تھے اور حضرت خالد بھی ایک مخلص مسلمان۔ مگر فطری صلاحیت کے اعتبار سے دونوں کے درمیان فرق تھا۔ انھوں نے کامل شعور کے ساتھ اس فرق کو پہچانا اور اس پر عمل کیا۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ نے اپنی صلاحیت کے لحاظ سے اپنے لئے خدمت اسلام کا ایک میدان منتخب کرلیا اور حضرت خالد نے اپنی صلاحیت کے لحاظ سے دوسرا میدان۔

حضرت خالد کہتے ہیں کہ میں جب بھی رسول اللہ صلے اللہ کے خلاف کسی مہم میں نکلتا تو ہمیشہ یہ احساس لے کر واپس آتا کہ میں اپنے آپ کو وہاں لگائے ہوئے ہوں جہاں مجھ کو نہیں لگانا چاہئے (انی موضع فی غیر شئ) یہ احساس انھیں ستاتا رہا یہاں تک کہ وہ فتح مکہ سے کچھ پہلے مدینہ آئے اور اسلام قبول کرلیا۔

حضرت خالد فطری طور پر انتہائی بہادر آدمی تھے۔ انھوں نے اپنی اس خصوصیت کو جانا اور اس کے موقع استعمال کا ادراک کیا۔ انھوں نے شعوری طور پر اس کو دریافت کیا کہ اسلامی خدمت

کے وسیع میدان میں وہ کیا خاص حصہ ادا کر سکتے ہیں۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی خداداد بہادرانہ صلاحیت کو شرک کے استیصال اور توحید کے قیام کے محاذ پر لگا دیں۔ چنانچہ وہ اسلامی فوج میں شامل ہو گئے۔

وہ ساری عمر اسی راہ میں سرگرم عمل رہے۔ وہ خدا سے اپنے لئے قوت اور استقامت کی دعا کرتے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی درخواست کرتے کہ وہ آپ کے لئے اس کی دعا فرمائیں۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی اسلامی جہاد میں صرف کر دی۔ حتیٰ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا کہ خالد اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہیں جس کو خدا نے مشرکین کے خلاف نکالا ہے (سیف من سیوف اللہ سلہ اللہ علی المشرکین)

دوسری مثال حضرت ابوہریرہ کی ہے۔ حضرت ابوہریرہ کے اندر حضرت خالد والی صلاحیتیں نہیں تھیں۔ البتہ انھوں نے محسوس کیا کہ ان کے اندر حافظہ کی قوت عام لوگوں سے زیادہ ہے۔ انھوں نے اپنی اس صلاحیت کو دین کے لئے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔

روایات میں آتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میرے لئے دعا فرمایئے کہ خدا مجھے وہ علم دے جس کو میں فراموش نہ کر سکوں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس پر آمین کہا اور حضرت ابوہریرہ کے حق میں یادداشت کی دعا فرمائی۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ کی غیر معمولی قوت حافظہ اسی پیغمبرانہ دعا کا نتیجہ ہے۔ مگر نفسیاتی اعتبار سے دیکھئے تو یہ دراصل خود حضرت ابوہریرہ کی اپنی تڑپ کا اظہار تھا۔ یہ دو طرفہ واقعہ تھا نہ کہ محض یک طرفہ۔

حضرت ابوہریرہ نے اپنی خداداد امتیازی صلاحیت کو پہچانا۔ اس کی حفاظت اور ترقی کی دعائیں کیں۔ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی اس کے لئے دعا کرائی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے دعا کرانا دراصل خود اپنی دعا کا ایک تسلسل تھا۔ اس طرح دعاؤں کے سائے میں وہ اپنی استعداد کے مطابق اپنے ممکن میدان میں ہمہ تن لگ گئے۔ وہ برابر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہتے۔ آپ کی باتوں کو پوری توجہ کے ساتھ سنتے۔ اس کو ذہن میں محفوظ رکھتے نیز حسب ضرورت اسے لکھ لیتے۔ اسی معرفت خویش کا یہ نتیجہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ اسلامی تاریخ میں وہ شخص قرار پائے جن کے ذریعہ اگلی نسلوں کو پیغمبر اسلام کی حدیثیں سب سے زیادہ تعداد میں پہنچی ہیں۔

ہر آدمی کی سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے۔ اپنے آپ کو جان کر وہ اپنے لئے بھی زیادہ مفید بن سکتا ہے اور دین کے لئے بھی۔

خواب میں

مسٹر رام رتن کپلا ریفریجریٹر اور ائر کنڈیشنر کا بزنس کرتے ہیں۔ ان کی فرم کا نام کیپسنس ہے نئی دہلی میں آصف علی روڈ پر اس کا صدر دفتر ہے۔

مسٹر رام رتن کپلا کو اپنے فرم کے لئے ایک سلوگن کی ضرورت تھی۔ انھوں نے اخبار میں اعلان کیا کہ جو شخص کم لفظوں میں ایک اچھا سلوگن بنا کر دے گا اس کو معقول انعام دیا جائے گا۔ بار بار کے اعلان کے باوجود کوئی ایسا شخص نہ ملا جو انھیں اچھا سلوگن دے سکے۔ بعض لوگوں نے کچھ فقرے لکھ کر بھیجے مگر مسٹر کپلا کو وہ پسند نہ آئے۔ "سلوگن کو Penetrating ہونا چاہئے۔ مگر یہ سلوگن Penetrating نہ تھے" انھوں نے ۴ دسمبر ۱۹۸۲ کی ایک ملاقات میں کہا۔

مسٹر کپلا اسی ادھیڑ بن میں رات دن لگے رہے۔ وہ مسلسل اس کے بارے میں سوچتے رہے۔ ان کا دماغ برابر سلوگن کی تلاش میں لگا ہوا تھا مگر کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔

اسی فکر میں تقریباً چھ سال گزر گئے۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ مسٹر کپلا نے ایک روز رات کو ایک خواب دیکھا۔ خواب میں انھوں نے دیکھا کہ وہ ایک باغ میں ہیں۔ نہایت سہانا موسم ہے۔ طرح طرح کی چڑیاں درختوں پر چہچہا رہی ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر وہ بے حد خوش ہو گئے۔ ان کی زبان سے نکلا:

ویدر (Weather) ہو تو ایسا

یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھ کھل گئی۔ اچانک انھیں معلوم ہوا کہ انھوں نے وہ سلوگن دریافت کر لیا ہے جس کی تلاش میں وہ برسوں سے سرگرداں تھے۔ فوراً ان کے ذہن میں یہ انگریزی جملہ مرتب ہو گیا:

KAPSONS: the weather masters

خواب انسانی دماغ کی وہ سرگرمی ہے جس کو وہ نیند کی حالت میں جاری رکھتا ہے۔ اگر آپ اپنے ذہن کو سارے دن کسی چیز میں مشغول رکھیں تو رات کے وقت وہی چیز خواب میں آپ کے سامنے آئے گی۔ تاریخ کی بہت سی ایجادات خواب کے ذریعہ ظہور میں آئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ موجد اپنی ایجاد میں اتنا مشغول ہوا کہ وہ سوتے میں بھی اسی کا خواب دیکھنے لگا۔ خواب دراصل کسی چیز میں کامل ذہنی وابستگی کا نتیجہ ہے۔ ایسے آدمی کے عمل کی مدت ۱۲ گھنٹے کے بجائے ۲۴ گھنٹے ہو جاتی ہے۔ یہی کسی مقصد میں کامیاب ہونے کا راز ہے۔ اس قسم کی گہری وابستگی کے بغیر کوئی بڑا کام نہیں کیا جا سکتا۔ نہ دنیا کا اور نہ آخرت کا۔

کامیاب تدبیر

ایک مغربی کمپنی نے موٹر کار کا ایک ٹائر بنایا۔ اس نے اشتہار دیا کہ جو شخص ہمارے ٹائر میں کوئی واقعی خرابی بتلائے گا اس کو پچاس ہزار ڈالر انعام دیا جائے گا۔ جب اس کمپنی کا ٹائر بازار میں آیا تو لوگ اس کو خریدنے کے لئے ٹوٹ پڑے۔ لوگوں نے سوچا کہ اگر کوئی خرابی نکال پائے تو پچاس ہزار ڈالر مل جائیں گے۔ ورنہ ٹائر تو ہے ہی۔

کمپنی کو بے شمار شکایت نامے موصول ہوئے۔ چھان بین کے بعد معلوم ہوا کہ ان میں سے ۲۰ فیصد خطوط قابل لحاظ ہیں۔ چنانچہ کمپنی نے ہر علاقہ کے منتخب مکتوب نگاروں کو دعوت نامے روانہ کئے۔ ان کو آمدورفت کا کرایہ دیا اور ان کو عمدہ ہوٹلوں میں ٹھہرایا۔ کمپنی کے تحت ایک سمینار میں یہ لوگ شریک ہوئے۔ ہر ایک نے اپنی اپنی تنقیدی رائیں پیش کیں۔ بحث مباحثہ کے بعد ایک متفقہ تجویز منظور ہوئی اور انعام بھی تقسیم کیا گیا۔

اس کے بعد کمپنی نے نیا ٹائر بنایا۔ اس نے نئے ٹائر کی قیمت پہلے کے مقابلہ میں دگنا کر دی جب اشتہار دیا گیا تو دوسرا ٹائر پہلے ٹائر سے بھی زیادہ فروخت ہوا۔ پہلا ٹائر کمپنی نے اپنی رائے سے بنایا تھا۔ دوسرے ٹائر میں عوام کی رائے شامل ہوگئ۔ لوگوں نے سمجھا کہ یہ ٹائر استعمال کرنے والوں کی تجاویز اور مشوروں کے مطابق بنایا گیا ہے۔ اس لئے وہ اس ٹائر سے زیادہ اچھا ہوگا جس کو کمپنی خود اپنی رائے سے بنائے۔

موجودہ دنیا میں ہر آدمی دوسرے آدمی سے بندھا ہوا ہے۔ ہر آدمی دوسروں کو شریک کرنے کے بعد کامیاب ہوتا ہے۔ اس لئے موجودہ دنیا میں کامیاب عمل کے لئے دوسروں کی رعایت ضروری ہے۔ آپ اپنی ذات کے لئے کوئی کامیابی اس وقت حاصل کر سکتے ہیں جب کہ دوسروں کو کامیاب بنانے میں بھی آپ نے کوئی حقیقی حصہ ادا کیا ہو۔

اس دنیا میں کامیاب ہونے کے لئے آدمی کو نفع بخش بننا پڑتا ہے۔ جن لوگوں سے وہ لے رہا ہے ان کو یہ یقین دلانا پڑتا ہے کہ وہ ان کو کچھ دے بھی رہا ہے۔ یہ دنیا دو طرفہ لین دین کا بازار ہے۔ جو دوسروں کو دے گا وہی دوسروں سے پائے گا۔ جس کے پاس دوسروں کو دینے کے لئے کچھ نہ ہو۔ اس کو شکایت نہ ہونی چاہئے اگر دوسرے اسے کچھ دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

جاپانی خاتون

جاپان کی عورتوں کے بارہ میں ایک رپورٹ اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ جاپان میں اگرچہ ۱۵ ملین کارکن خواتین موجود ہیں۔ مگر یہ زیادہ تر معمولی کاموں میں مصروف ہیں۔ وہ اپنے مرد افسروں (Male superiors) کی مددگار کے طور پر کام کرتی ہیں۔

۳۶ سال کے بعد دو خواتین جاپانی کابینہ میں لی گئی ہیں۔ وہ بھی زیادہ تر متحدہ اقوام کے موسم خواتین کی رعایت سے جو ۱۹۸۵ میں ختم ہو رہا ہے۔ جاپان میں اس وقت ۶۰۸ ڈپلومیٹ ہیں۔ ان میں خواتین کی تعداد صرف ۱۲ ہے۔ جاپان آج بھی بنیادی طور پر مردوں کا سماج (Male-dominated society) ہے۔

رپورٹ میں جاپان کی موجودہ خاتون وزیر کے یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں :

> A bill, yet to be passed by the parliament, on ending discrimination against women, is considered by many of its male critics as reverse discriminatory.

عورتوں کے خلاف امتیاز کو ختم کرنے والا ایک بل جاپانی پارلی منٹ میں ہے مگر وہ اب تک پاس نہ ہو سکا۔ اکثر مرد ناقدین اس بل کو برعکس امتیاز پیدا کرنے والا اقدام سمجھتے ہیں (انڈین اکسپریس ۲۴ نومبر ۱۹۸۴)

جو لوگ کہتے ہیں کہ عورتوں کی مساوی شرکت کے بغیر قومی ترقی نہیں ہو سکتی انھیں اس واقعہ سے نصیحت لینا چاہئے۔ جاپان دور جدید کا انتہائی ترقی یافتہ ملک ہے۔ مگر یہ ترقی اس کو اس کے بغیر حاصل ہوئی ہے کہ اس نے اپنی خارجی سرگرمیوں کے تمام میدانوں میں عورتوں کو برابر کے شریک کی حیثیت سے داخل کر دیا ہو۔

قدیم زمانہ میں عورت اور مرد کے کام کا دائرہ الگ الگ سمجھا جاتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں اس حد بندی کو ختم کر دیا گیا۔ دلیل یہ دی گئی کہ اس سے ترقی کی رفتار تیز ہوگی۔ مگر تجربہ نے بتایا کہ تقسیم عمل کے قدیم نظام کو توڑنے کا کوئی فائدہ تمدنی ترقی کے اعتبار سے نہیں ہوا۔ جن ملکوں میں عورت اور مرد دونوں کو زندگی کے ہر میدان میں برابر کا شریک قرار دیا گیا ہے وہاں بھی عملاً زندگی کے تمام ترقیاتی کام مردوں ہی کے ہاتھ میں ہیں نہ کہ عورتوں کے ہاتھ میں۔

جاپان کی مذکورہ مثال بھی اس کی تردید کرتی ہے۔ جاپان پورے معنوں میں دور جدید کا ایک ترقی یافتہ ملک ہے۔ مگر وہاں کا سماج ابھی تک قدیم انداز کے مطابق مردوں کے غلبہ کا سماج ہے۔ جاپان کی مثال ثابت کرتی ہے کہ ترقی کے لئے عورتوں کی مفروضہ مساوی شرکت ضروری نہیں۔

صبر کی ضرورت

مغل حکمراں اورنگ زیب کو اپنے والد شاہ جہاں سے سیاسی اختلاف ہوا۔ ۱۶۵۸ء میں اس نے شاہ جہاں کو تخت سے بے دخل کر کے آگرہ کے قلعہ میں قید کر دیا۔ اسی حال میں شاہجہاں ۱۶۶۶ء میں ۷۴ سال کی عمر میں مرگیا۔ اسیری کے زمانہ میں اس کی بہن جہاں آرا بھی قلعہ میں اس کے ساتھ تھی۔ شاہ جہاں آگرہ کے قلعہ سے تاج محل کو دیکھا کرتا تھا اور اشعار پڑھتا رہتا تھا۔

ڈاکٹر آر۔ سی۔ مجمدار، ڈاکٹر ایچ۔ سی۔ رائے چودھری اور ڈاکٹر کالی کنکر دتہ نے اپنی مشترک کتاب تاریخ ہند (An Advanced History of India) میں شاہ جہاں کے آخری حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے مذہب میں اپنی تسکین کا سامان پالیا۔ اور صبر کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے اپنے آخری ایام اپنی پارسا لڑکی جہاں آرا کے ساتھ عبادت اور مراقبہ میں گزار دئے یہاں تک کہ مرگیا:

> He found solace in religion, and, in a spirit of resignation, passed his last days in prayer and meditation in the company of his pious daughter, Jahanara, till his death (p. 477).

کہا جاتا ہے کہ ایک عرصہ کے بعد شاہ جہاں قید کی زندگی سے گھبرا اٹھا۔ اس نے اورنگ زیب کو ایک مصرعہ لکھ کر بھیجا جس کا مطلب یہ تھا کہ یا تو ہم کو مار ڈالو یا دام دو یا پھر ہم کو آزاد چھوڑ دو:

یا بکش یا دام دہ یا از قفس آزاد کن

اورنگ زیب نے بھی اس کے جواب میں ایک اور مصرعہ لکھ کر شاہ جہاں کے پاس بھیج دیا۔ جو یہ تھا کہ ہوشیار چڑیا جب جال میں پھنس جائے تو اس کو برداشت سے کام لینا چاہئے:

مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

ہوسکتا ہے کہ یہ واقعہ نہ ہو، صرف ایک لطیفہ ہو۔ تاہم یہ بذات خود ایک حکمت کی بات ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کسی غلطی یا کسی حادثہ کی بنا پر ایک ایسی صورت حال میں پھنس جاتا ہے جو اس کے لئے عام حالات میں بالکل ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ مگر اب جہاں وہ پھنس گیا ہے وہاں سے فوری طور پر نکلنا عملاً ممکن نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں گھبرا کر کوئی اقدام کرنا سراسر نادانی ہے۔ جال میں پھنسنے کے بعد چڑیا اگر پھڑپھڑائے تو وہ اور زیادہ پھنستی چلی جاتی ہے۔ اسی طرح کسی نازک صورت حال میں پھنس جانے کے بعد آدمی اگر بے صبری کے ساتھ کارروائی کرے تو وہ اور زیادہ اس میں الجھ جائے گا۔

حکمت کا یہ اصول افراد کے لئے بھی ہے اور قوموں کے لئے بھی۔



بہت سے لوگ

بہت سے لوگ جو اعلان کرتے ہیں کہ سونے اور چاندی کے سکوں میں ان کی قیمت نہیں لگ سکتی وہ اس وقت بازار میں بکنے والا مال بن جاتے ہیں جب کہ عزت اور شہرت کے سکوں میں ان کی قیمت ادا کردی جائے۔

بہت سے لوگ جو بتوں کو توڑنے کی مہم کے امام بنے ہوئے ہیں وہ اس وقت سب سے بڑے بت پرست ثابت ہوتے ہیں جب کہ ان کو خود اپنا بت ٹوٹتا ہوا نظر آئے۔

بہت سے لوگ جو اسلام کو اپنی عظمت کا پرفخر نشان بنائے ہوئے ہیں وہ اس وقت اسلام کو نظرانداز کردیتے ہیں جب کہ اسلام ان سے اپنے آپ کو بے عظمت کرنے کا مطالبہ کرے۔

بہت سے لوگ جو خدا کی بڑائی کے نام پر دوسروں کو چھوٹا کرنے کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہیں وہ اس وقت اپنی تردید آپ بن جاتے ہیں جب کہ انھیں خدا کی بڑائی کے لئے خود اپنے آپ کو چھوٹا کرنا پڑے۔

بہت سے لوگ جو مکمل اسلامی حکومت سے کم کسی چیز پر راضی ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں وہ اس وقت اپنے دعوے کے برعکس ثابت ہوتے ہیں جب کہ اسلامی حکومت کی حدود کو ان کی اپنی ذات تک وسیع کیا جائے۔

بہت سے لوگ جو دوسروں کے بچوں کو میدان جہاد میں بھیجنے کے لئے بہادر بنے ہوتے ہیں وہ اس وقت غیر بہادر ثابت ہوتے ہیں جب کہ انھیں خود اپنے بچوں کو میدان جہاد میں ذبح ہونے کے لئے بھیجنا پڑے۔

بہت سے لوگ جو احتساب عالم سے کم کوئی لفظ بولنے کو اسلام کی تصغیر سمجھتے ہیں وہ اس وقت بالکل دوسرے انسان ثابت ہوتے ہیں جب کہ اس احتساب عالم کی فہرست میں خود ان کی ذات کے احتساب کو بھی شامل کرلیا جائے۔

بہت سے لوگ جو ملت کے احیار کے لئے مردان کار کا انتظار کررہے ہیں۔ وہ اس وقت ان کے سب سے بڑے دشمن بن جاتے ہیں جب کہ خدا مطلوبہ مردان کار پیدا کرکے انھیں ان کے سامنے کھڑا کردے۔

تعلیمی پیغام

تعلیم صرف روزگار کا سرٹیفکٹ نہیں۔ اس کا اصل مقصد قوم کے افراد کو باشعور بنانا ہے۔ افراد کو باشعور بنانا ملت کی تعمیر کی راہ کا پہلا قدم ہے۔ ملت کا سفر جب بھی شروع ہوگا یہیں سے شروع ہوگا۔ اس کے سوا کسی اور مقام سے ملت کا سفر شروع نہیں ہو سکتا۔

باشعور بنانا کیا ہے۔ باشعور بنانا یہ ہے کہ ملت کے افراد ماضی اور حال کو ایک دوسرے سے جوڑ سکیں۔ وہ زندگی کے مسائل کو کائنات کے ابدی نقشہ میں رکھ کر دیکھ سکیں۔ وہ جانیں کہ وہ کیا ہیں۔ اور کیا نہیں ہیں۔ وہ اس راز سے واقف ہوں کہ وہ اپنے ارادہ کو خدا کے ارادہ سے ہم آہنگ کر کے ہی خدا کی اس دنیا میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ باشعور انسان ہی حقیقی معنوں میں انسان ہے۔ جو باشعور نہیں وہ انسان بھی نہیں۔

باشعور آدمی اپنے اور دوسرے کے بارہ میں صحیح رائے قائم کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ وہ یہ جان لیتا ہے کہ اس کی کون سی رائے جانب دارانہ رائے ہے اور کون سی غیر جانب دارانہ۔ جب بھی کوئی موقع آتا ہے تو وہ پہچان لیتا ہے کہ یہاں کون سی کارروائی ردعمل کی کارروائی ہے اور کون سی مثبت کارروائی۔ وہ شر کو خیر سے جدا کرتا ہے اور باطل کو الگ کر کے حق کو پہچانتا ہے۔ ایک آنکھ وہ ہے جو ہر آدمی کی پیشانی پر ہوتی ہے۔ تعلیم آدمی کو ذہنی آنکھ عطا کرتی ہے۔ عام آنکھ آدمی کو ظاہری چیزیں دکھاتی ہے، تعلیم کی آنکھ آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ معنوی چیزوں کو دیکھ سکے۔

جس طرح ایک کسان بیج کو درخت بناتا ہے، اسی طرح تعلیم گاہ کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کو فکری حیثیت سے اس قابل بنائے کہ وہ ارتقائے حیات کے سفر کو مکمل کر سکے۔ تعلیم آدمی کو ملازمت بھی دیتی ہے۔ مگر یہ تعلیم کا ثانوی فائدہ ہے۔ تعلیم کا اصل پہلو یہ ہے کہ وہ آدمی کو زندگی کی سائنس بتائے۔ وہ آدمی کو حقیقی معنوں میں آدمی بنا دے۔

ہمارے مدارس

صحابہ ہمیشہ اساسات دین پر متوجہ رہتے تھے۔ مگر بعد کو عباسی خلافت کے زمانہ میں دوسری قوموں کے اثر سے مسلمانوں کا یہ حال ہوا کہ وہ اساسات دین کے بجائے جزئیات دین کو طے کرنے میں الجھ گئے۔ ان کے درمیان عجمی قوموں کے اختلاط سے نئے نئے مسائل پر بحثیں ہونے لگیں۔ یہ بحثیں حقیقۃً ان امور پر نہ تھیں جو قرآن وحدیث میں واضح الفاظ میں بیان کئے گئے ہیں۔ بلکہ زیادہ تر ان پہلوؤں پر تھیں جو لوگوں نے اپنے غیر ضروری قسم کے خوض وتعمق سے خود پیدا کیا تھا۔ فقہ میں جزئیاتی امور پر بحثیں پیدا ہوگئیں اور اعتقادیات میں کلامی موشگافیوں سے پیدا شدہ مسائل لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئے۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت جو اسلامی نظام تعلیم بنا اس میں انھیں فقہی اور اعتقادی بحثوں نے سب سے زیادہ جگہ حاصل کرلی۔ حتی کہ خود قرآن وحدیث بھی اب انھیں اختلافی بحثوں کی روشنی میں پڑھائے جانے لگے۔ یہ انداز تعلیم جو ابتداءً عباسی دور میں رائج ہوا بعد کو مقدس بن کر اسلامی نظام تعلیم کا لازمی جزء بن گیا اور آج بھی وہ کسی نہ کسی طرح اس کا لازمی جزء بنا ہوا ہے۔ جو چیز صرف اسلام کی تاریخ تھی اس کو اسلام کی حقیقت سمجھ لیا گیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی درس گاہوں سے اس سے بالکل مختلف انسان بن کر نکلنے لگے جو قرآن کو مطلوب تھے۔ قرآن کو اسلامی تعلیم سے ایسے انسان مطلوب تھے جو اللہ سے ڈریں (انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء) اور جو دنیا کے لوگوں کو آنے والے سخت دن سے ہوشیار کریں (ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم) مگر اب اسلام کے تعلیمی نظام سے ایسے لوگ پیدا ہونے لگے جو جزئیاتی بحثوں کے ماہر ہوں اور اختلافی مسائل میں کمال فن کی داد دے سکیں۔

اس فرق کا مزید شدید تر نقصان یہ ہوا کہ ہمارے مدارس قساوت اور بے حسی کی تربیت گاہ بن گئے۔ اگر آپ خدا کی عظمت کا تذکرہ کریں، اگر آپ جنت اور جہنم کو یاد کریں تو آپ کے اندر خشوع اور تقویٰ کے جذبات ابھریں گے۔ اس کے برعکس اگر آپ ظاہری جزئیات اور لفظی موشگافیوں میں بحث ومباحثہ کریں تو اس سے صرف قساوت کو غذا ملے گی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے مدارس خشوع کے بجائے غفلت اور قساوت کی پیداوار کا مرکز بن کر رہ گئے ہیں۔

بے قیمت الفاظ

ہمارے قائدین اپنی تقریروں اور تحریروں میں ہر روز مسلمانوں کو بتاتے رہتے ہیں کہ مسلمان کیا کریں۔ وہ مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ :

مسلمان متحد ہو جائیں

مسلمان اس ملک کی اخلاقی قیادت کریں

مسلمان خیر امت کا کردار ادا کریں

یہ مشورے یقیناً بہت اچھے مشورے ہیں مگر وہ سادہ معنوں محض مشورے نہیں ہیں۔ وہ عظیم ترین قربانی کے مطالبے ہیں۔ آدمی قربانی کی قیمت پر ہی ان مشوروں پر قائم ہو سکتا ہے ـــــ متحد ہونے کی قیمت ہے اختلاف کے باوجود متحد ہونا۔ اخلاقی قیادت کی قیمت ہے تلخیوں کے باوجود اخلاق پر قائم رہنا۔ خیر امت کا کردار ادا کرنے کی قیمت ہے شکایتوں کے باوجود لوگوں کا خیر خواہ ہونا۔

یہ سب اعلیٰ ظرفی کی باتیں ہیں اور اعلیٰ ظرفی کا یہ معیار وہ ہے جس پر خود مشورہ دینے والے قائدین بھی پورے نہیں اترتے۔ پھر وہ عوام اعلیٰ ظرفی کے اس معیار پر کیسے پورے اتریں گے۔ جن کو تقریر و تحریر کی صورت میں یہ قیمتی مشورے دئے جا رہے ہیں۔ ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ اسی طرح مشورے کی بھی ایک قیمت ہے۔ اور وہ ہے آدمی کا اول المسلمین ہونا یعنی مشورہ دینے والا خود اس اصول پر قائم ہو جس کا مشورہ وہ دوسروں کو دے رہا ہے۔ ایک ایسا مشورہ جس کی قیمت ادا نہ کی گئی ہو سراسر لاحاصل ہے۔ اس کا کوئی فائدہ نہ مشورہ دینے والے کے حصہ میں آتا ہے اور نہ اس کے حصہ میں جس کو مشورہ دیا گیا ہے۔

جو لوگ اختلاف کے وقت بے برداشت ہو جاتے ہیں۔ جو شکایت پیدا ہوتے ہی آدمی کے دشمن بن جاتے ہیں۔ جن کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے مداحوں کے لئے با اخلاق ہیں اور اپنے ناقدین کے لئے بے اخلاق۔ وہی لوگ دوسروں کو اتحاد اور اعلیٰ کردار کا مشورہ دے رہے ہیں۔

اس قسم کا مشورہ دینے والے قائدین پر حضرت مسیح کے وہ الفاظ صادق آتے ہیں جو آنجناب نے یہودی پیشواؤں کے بارہ میں فرمائے تھے :

" اے شرع کے عالمو، تم پر افسوس کہ تم ایسے بوجھ جن کو اٹھانا مشکل ہے۔ آدمیوں پر لادتے ہو اور آپ ایک انگلی بھی ان بوجھوں کو نہیں لگاتے (لوقا ۱۱ : ۴۶)

اور وہ غالب ہو گئے

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اے ایمان لانے والو، تم لوگ اللہ کے مددگار بنو جیسا کہ عیسٰی ابن مریم نے حوارییں سے کہا کہ کون اللہ کے لئے میرا مددگار بنتا ہے۔ حواریوں نے کہا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار۔ پس بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ ایمان لایا اور ایک گروہ منکر ہو گیا۔ پھر ہم نے ایمان لانے والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں مدد کی اور وہ غالب ہو گئے (الصف ۱۴)

مگر واقعات بتاتے ہیں کہ مومنین مسیح بہت تھوڑے اور کمزور تھے اور مخالفین بہت زیادہ اور طاقت ور تھے۔ چنانچہ اس وقت عملاً جو ہوا وہ یہ کہ حضرت مسیح کی دعوتی جدوجہد کی تکمیل کے بعد یہود کے منکر طبقہ نے آپ کے ساتھیوں کو دبا لیا اور بزعم خود پیغمبر کو سولی پر چڑھا دیا۔ پھر سوال یہ ہے کہ فاصبحوا ظاہرین کا واقعہ کب اور کیوں کر پیش آیا۔

قصہ یہ ہے کہ وقتی طور پر تو منکرین مسیح کا گروہ غالب آگیا۔ انھوں نے حضرت مسیح کو سولی پر چڑھانے کی کوشش کی مگر آپ کو خدا نے عزت کے ساتھ آسمان پر اٹھا لیا۔ مگر خدا کا قانون یہ ہے کہ اتمام حجت کے بعد انکار کو وہ معاف نہیں کرتا۔ چنانچہ جو کام مسیح کے ابتدائی مومنین نہ کر سکے تھے اس کو دوسروں کے ذریعہ لیا گیا۔ ۷۰ء میں رومی شہنشاہ تیتس نے یروشلم پر حملہ کیا اور مخالفین مسیح (یہود) میں کچھ کو ہلاک کیا اور کچھ کو ذلیل کر کے ان کے مرکز سے نکال دیا جس کے بعد وہ تتر بتر ہو گئے۔ دوسری طرف مسیح کے ماننے والوں (نصاریٰ) کو یہ موقع ملا کہ وہ مسیحیت کے مبلغ بن کر اطراف کے ملکوں میں پھیلے۔ وہ رومی شہنشاہیت میں داخل ہوتے۔ انھوں نے اپنی تبلیغ سے بہت سے لوگوں کو عیسائی بنایا۔ توسیع مسیحیت کا یہ عمل جاری رہا۔ یہاں تک کہ رومی شہنشاہ قسطنطین اعظم (۲۷۲-۳۳۷ء) نے مسیحیت قبول کر لی۔ یہ الناس علیٰ دین ملوکہم کا زمانہ تھا۔ رومی شہنشاہ کے قبول مسیحیت کے بعد اس کی پوری مملکت میں مشرق سے مغرب تک مسیحیت پھیلنے لگی۔ حضرت مسیح کے رفع کے تین سو سال بعد یہ حال ہوا کہ رومی شہنشاہیت کے اکثر باشندے مسیحی بن گئے۔ یہاں تک کہ مسیحیت دنیا کا سب سے بڑا مذہب بن گیا۔ یہودی مسیحی قوموں کے محکوم ہو گئے، حتیٰ کہ موجودہ اسرائیل بھی۔

A RETURN TO RELIGION

"There's no doubt about it", says Harvey R. Cox, Professor of Divinity at the Harvard Divinity School, "There's a tremendous resurgence of religious interest here." It is not uncommon to see students wearing crosses or yarmulkes on campuses across the United States, and few hide the fact that they go to church or synagogue. Not just students, but the academic community in general, long a haven for skeptics, is now giving religion a second look. Cox's bestselling 1965 book, The Secular City, suggested that people had lost interest in the sacred. His new book, Religion In The Secular City, describes the current revival in religious concern. A century that has seen the Gulag, the Holocaust, Hiroshima and the spread of nuclear arms has caused some who used to champion rationalism and science to humble themselves. Since their secular gods have failed, they are beginning to view more traditional gods with a new curiosity. "There is a reaction against extreme individualism and self, a preoccupation with and a search for roots with a capital R, which takes people back to religion," says Robert N. Bellah, Ford Professor of Sociology and Comparative Studies at the University of California at Berkeley. "Tradition is back on the agenda with a positive force." It would have been hard to imagine a similar revival 20 years ago. On April 8, 1966, Time magazine asked on its cover: "Is God Dead?" Among intellectuals today, God is not pronounced dead easily. Science and religion are not viewed as necessarily incompatible, and logical attempts to disprove God's existence are viewed as somewhat arcane. All of this would have surprised our intellectual predecessors. "At the end of the 18th and to the middle of the 19th century, almost every enlightened thinker expected religion to disappear in the 20th century," Daniel Bell said in a seminal lecture, "The Return of the Sacred," at the London School of Economics in 1977. "The belief was based on the power of reason." The theory was that man could use his mind to overcome his problems, and religion would wither away. But that has hardly been the case. "We've gained enormous power over nature via technology," Bell said in an interview. "And yet, the 20th century is probably the most dreadful period in human history." For intellectuals, according to Bell, there have always been secular alternatives to religious faith: rationalism and the belief in science; aestheticism and the belief in art; existentialism as expressed in the works of Kierkegaard and the early Sartre, and politics — the cults of Stalin, Lenin and Mao. Yet, one by one, those alternatives, according to Bell, have exhausted their power to move individuals. "It's ironic that my generation should be the one coming back to religion," says Alan Dershowitz, 45, professor of law at Harvard Law School. "We were the generation that had all the freedom and all the choice." And yet, it is the rootlessness of much of that freedom that has brought so many intellectuals back to religion. "I can't say to you I believe in God," says Coles, who might be described as a spiritual wanderer rather than as a believer in any particular faith. "There are moments when I do stop and pray to God. But if you ask me who that God is or what kind of image He has, my mind boggles. I'm confused, perplexed, confounded. But I refuse to let that confusion be the dominant force in my life."

مذہب کی طرف واپسی

امریکہ کے ٹائم میگزین (۸ اپریل ۱۹۶۶) کی کور اسٹوری (خصوصی مضمون) کا عنوان تھا "کیا خدا مر چکا ہے" یہ ۲۰ سال پہلے کی بات تھی۔ اب خود مغربی دنیا میں ایسی کتابیں اور مضامین مسلسل شائع ہو رہے ہیں جن کا عنوان اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ماہنامہ اسپان (دسمبر ۱۹۸۴) میں ایک مفصل رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس کی سرخی کے الفاظ یہ ہیں "مذہب کی طرف واپسی"

یہ رپورٹ الرسالہ کے انگریزی اڈیشن میں نقل کی جا رہی ہے۔ اس کا خلاصہ یہاں مقابل کے صفحہ پر درج ہے۔ اس کے مطابق امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں میں مختصر وقفہ کے بعد مذہب از سر نو زندہ ہو رہا ہے۔ کالجوں میں دینیات کی کلاس جو پہلے خالی رہتی تھی اب بھری رہتی ہے۔ چرچ اور سینیگاگ (یہودی عبادت خانہ) میں جانے والوں کی تعداد کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ مذہبی لٹریچر پڑھنے والوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ مذہب کے نام پر کانفرنسیں کثرت سے منعقد کی جا رہی ہیں۔ ایک پروفیسر کے الفاظ ہیں، یہاں مذہب میں دلچسپی کا حیرت ناک احیاء ہوا ہے۔

ایک مغربی دانشور جس نے ۱۹۶۵ میں "سیکولر شہر" نامی کتاب میں بتایا تھا کہ لوگوں نے مقدس چیزوں میں اپنی دلچسپی کھو دی ہے، اب وہ اپنی دوسری کتاب "سیکولر دنیا میں مذہب" میں دکھا رہا ہے کہ مذہب میں لوگوں کی دلچسپی از سر نو بحال ہو گئی ہے۔ دانشور طبقہ جو عرصہ سے شک کی بنا پر مذہب کو نظر انداز کئے ہوئے تھا وہ مذہب کی طرف دوبارہ دیکھنے لگا ہے۔

ڈینیل بل نے لکھا ہے کہ ۱۸ ویں صدی کے آخر سے لے کر ۱۹ ویں صدی کے نصف تک تقریباً ہر ترقی پسند مفکر یہ خیال کرتا تھا کہ مذہب ۲۰ ویں صدی میں ختم ہو جائے گا۔ یہ عقیدہ عقل کی طاقت کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا۔ نظریہ یہ تھا کہ انسان اپنے دماغ سے اپنے مسائل کو حل کرلے گا اور اس کے بعد مذہب اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ ہم نے ٹکنالوجی کے ذریعہ غیر معمولی طاقت فطرت کے اوپر حاصل کرلی۔ اس کے باوجود ۲۰ ویں صدی غالباً انسانی تاریخ کی سب سے بھیانک صدی ہے۔

چونکہ انسان کے سیکولر خدا ناکام ہو گئے ہیں، وہ روایتی خدا کی طرف زیادہ سے زیادہ دیکھنے

لگا ہے۔ ایک پروفیسر کے الفاظ میں روایت دوبارہ مثبت قوت کے ساتھ ایجنڈا پر آگئی ہے۔

مذہب کی طرف یہ واپسی حقیقۃً فطرت کی طرف واپسی ہے۔ یعنی اس خدا کی طرف واپسی جس کا احساس اس کی فطرت میں پیوست ہے نہ کہ اس خدا کی طرف جس کی نمائندگی وہ اپنے موروثی مذہب میں پارہا ہے۔

ہارورڈ لا اسکول کے پروفیسر آلن ڈرشووٹز (۴۵) نے کہا کہ یہ بڑی عجیب چیز ہے کہ میری نسل مذہب کی طرف واپس آئے۔ ہم وہ نسل ہیں جس کو ہر قسم کی آزادی اور ہر طرح کی چھوٹ حاصل تھی۔ مگر ہمیں یہ تجربہ ہوا کہ اس آزادی کی کوئی جڑ نہیں۔ یہی بے جڑ ہونے کا احساس ہے جو اکثر دانشوروں کو دوبارہ مذہب کی طرف لایا ہے۔ ایک دوسرے پروفیسر مسٹر کولس نے کہا کہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں خدا میں عقیدہ رکھتا ہوں۔ میں روحانیت کی تلاش میں ہوں نہ کہ کسی خاص مذہب کو ماننے والا۔

میری زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں جبکہ میں ٹھہر جاتا ہوں اور خدا کو پکارنے لگتا ہوں۔ لیکن اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ وہ خدا کون ہے اور اس کی صورت کیا ہے تو میں تردد میں پڑ جاؤں گا۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں انتشار ذہنی کا شکار ہوں۔ اگرچہ میں نہیں چاہتا کہ ذہنی انتشار میری زندگی پر پوری طرح چھا جائے۔

تبصرہ

یہ صورت حال جو غیر مسلم اقوام میں پیدا ہوئی ہے یہی خود مسلمانوں میں بھی پیدا ہوئی ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر بھی دین کی طرف ازسرنو رجوع پیدا ہوا ہے۔ مگر اس رجوع کا تعلق کسی عہد ساز مفکر یا کسی خدا رسیدہ بزرگ سے نہیں ہے۔ یہ تمام تر ایک زمانی مظہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر قوم میں یکساں طور پر پیدا ہوا ہے۔ مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی، یہودی، بدھسٹ وغیرہ سب کے یہاں اس کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اس میں ایک مذہب اور دوسرے مذہب کا کوئی فرق نہیں۔

اس نئی صورت حال کی وجہ مغربی انسان کی وہ مایوسی ہے جو اس کو موجودہ صدی میں پیش آرہی ہے۔ بیسویں صدی عقلیت اور سائنس کی صدی تھی۔ جدید انسان کو یقین ہوگیا تھا کہ وہ اپنی عقل اور اپنی سائنس سے وہ سب کچھ حاصل کرلے گا جس کی امید پہلے صرف مذہب سے کی جاتی تھی۔ مگر اس کی امیدیں پوری نہیں ہوئیں۔ انسان کی عقلیت نے اس کو صرف بے یقینی تک پہنچایا اور اس کی سائنس ایٹمی جنگ کا سیاہ بادل بن کر اس کے سر پر منڈلانے لگی۔ چوں کہ لوگوں کے سیکولر خدا ناکام ہوگئے۔ اس

لئے لوگوں نے روایتی خدا کی طرف زیادہ توجہ کے ساتھ دیکھنا شروع کر دیا۔

اس طرح موجودہ صورت حال نے ہمارے لئے ایک نیا امکان کھولا ہے۔ اس نے خدا کے محفوظ دین (اسلام) کی تبلیغ و اشاعت کا ایک نیا موافق میدان پیدا کر دیا ہے۔ آج کا انسان خدا اور مذہب کی تلاش میں نکلا ہے۔ مگر یہ تمام تر فطرت کے زور پر ہے۔ موجودہ مذاہب تحریف ہو جانے کی بنا پر اس کی تلاش کا حقیقی جواب نہیں ہیں۔ یہاں ضرورت ہے کہ اس کو بتایا جائے کہ جس مذہب کی تمہیں تلاش ہے وہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین میں موجود ہے۔ اسلام اسی مذہب کا غیر محرف اڈیشن ہے جس کو تم محرف مذاہب میں ناکام طور پر تلاش کر رہے ہو۔

دنیا کے موجودہ حالات دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے لوگوں کو لاکر اپنی رحمت کے دروازہ پر کھڑا کر دیا ہے۔ وہ لوگوں کو مجبور کر کے انھیں دین حق میں داخل کرنا چاہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آسمان سے لوگوں کی ہدایت اتر چکی ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم حق کو طالبان حق تک پہنچادیں۔

حضرت جی

۲؍اپریل ۱۹۶۵ء کی شب کو تین بجے ایک ہوائی جہاز دہلی کے ہوائی اڈہ پر اترا۔ اس میں ایک مسافر تھا جو لاہور سے دہلی لایا گیا تھا۔ مسافر کی آمد ٹھیک اپنے پروگرام کے مطابق ہوئی۔ مگر اس طرح کہ اس کا جسم تو دہلی آیا اور روح اپنے رب کے پاس ابدی آرام کے لیے پہونچ چکی تھی۔

یہ مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے جنہیں تبلیغ کے لوگ عام طور پر "حضرت جی" کہتے ہیں۔ وہ فروری ۱۹۶۵ء کے دوسرے ہفتہ میں براستہ لاہور ڈھاکہ کے اجتماع میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ اس سلسلے میں سابق مشرقی پاکستان کے مختلف مقامات کا دورہ کرتے ہوئے دوبارہ مغربی پاکستان واپس آئے اور یہاں بھی مختلف شہروں میں ان کا بہت مصروف پروگرام رہا۔ اس سفر کی آخری منزل لاہور تھی۔ وہاں کے اجتماعات کی کارروائیوں میں بھی مکمل شرکت کی۔ اس کے بعد ۲ اپریل کو جمعہ کے دن بذریعہ ٹرین سہارن پور کے لیے روانہ ہونے والے تھے کہ اسی دن اچانک قلب کا حملہ ہوا اور ۲ بجے دن میں انتقال ہوگیا۔ انتقال کے بعد جنازہ رات کو لاہور سے دہلی لایا گیا۔

مولانا محمد یوسف صاحب ۲ مارچ ۱۹۱۷ء کو پیدا ہوئے۔ اپنے والد مرحوم مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد ۱۲ جولائی ۱۹۴۴ء کو تبلیغ کا کام سنبھالا اور اکیس سال تک برابر اسی کام میں لگے رہے۔ اس مختصر مدت میں اتنی زبردست کامیابی حاصل کی کہ وہ تحریک جو "میوات کے اَن پڑھ مسلمانوں کو کلمہ و نماز سکھانے کی تحریک کے نام سے مشہور تھی اس کو پہلے ملکی اور پھر ایک بین اقوامی تحریک بنا دیا اور ہر طبقہ اور ہر ذہنی سطح کے لوگوں کو اس کثرت سے متاثر کیا کہ ایک بزرگ کے الفاظ میں۔ "اس کی نظیر قریب کی پچھلی صدیوں میں مشکل سے ملے گی۔

مولانا محمد منظور نعمانی صاحب راوی ہیں کہ مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی

وفات کے چند مہینے بعد مراد آباد میں ایک تبلیغی اجتماع ہو رہا تھا۔ تبلیغ کے لیے اوقات دینے کا رواج اس وقت تک میوات سے باہر بہت ہی کم ہوا تھا۔ فجر کی نماز کے بعد مولانا محمد یوسف صاحب نے تقریر کی اور اس کے بعد اوقات کا مطالبہ شروع ہوا۔ مگر بہت کم لوگوں نے اپنے نام لکھوائے۔ بجنور، چاندپور اور رام پور جیسے قریبی مقامات کے لیے دس دس آدمیوں کی جماعتیں بھی نہیں بن سکی تھیں۔ کئی آدمی ترغیب دلانے میں مصروف تھے اور اپنا پورا زور لگا رہے تھے مگر ناموں میں بالکل اضافہ نہیں ہو رہا تھا۔ مولانا یوسف صاحب جو تقریر کرنے کے بعد مسجد کے اندرونی حصے میں چلے گئے تھے۔ لوگوں کی سرد مہری دیکھ کر یکایک اٹھے اور مائیکروفون ہاتھ میں لے کر فرمانا شروع کیا کہ "آج تم بجنور، چاندپور، رام پور جیسے قریبی مقامات کے لیے اور صرف تین تین دن کا وقت دینے کے لیے تیار نہیں ہو رہے ہو، لیکن وقت آئے گا جب تم شام جاؤ گے، مصر جاؤ گے، عراق جاؤ گے۔ مگر اس وقت اجر گھٹ جائے گا۔ کیونکہ اس وقت اس کا عام رواج ہو چکا ہوگا۔" مولانا محمد یوسف کی یہ بات جو ۱۹۴۵ء میں ایک خیالی بات معلوم ہوتی تھی، آج واقعہ بن چکی ہے۔ تبلیغی جماعتوں کی نقل و حرکت آج نہ صرف شام و عرب بلکہ یورپ، جاپان، امریکہ، افریقہ اور اقصائے مشرق سے اقصائے مغرب تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ رات دن کا کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوتا جب تبلیغی جماعت کے وفود دنیا کے مختلف حصوں میں گشت نہ کر رہے ہوں۔

دعوت میں انہماک

مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جن لوگوں نے بھی قریب سے دیکھا ہے (اور ایسے لوگ بلا شبہ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں ہیں)، وہ جانتے ہیں کہ مولانا کو اپنی دعوت میں کس قدر انہماک تھا۔ ایک صاحب جو لاہور میں نماز فجر کے بعد مولانا کی ایک تقریر میں شریک تھے، فرماتے ہیں کہ نماز کے بعد مولانا نے تقریر شروع کی اور پورے تین گھنٹے تک انتہائی جوش و خروش کے ساتھ مجمع کو خطاب کرتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی لاوا پھوٹ پڑا ہے اور ماحول کو گرمائے نہیں بلکہ پگھلائے جا رہا ہے۔ ۸ ½ بجے خطاب ختم ہوا اور ناشتہ کا دستر خوان بچھایا گیا۔ مولانا نے دستر خوان پر بیٹھتے ہی پھر گفتگو شروع فرما دی اور اس انداز سے الفاظ زبان سے نکلنے لگے کہ گفتگو کے زور، استدلال کی ندرت اور مطالب کی آمد کو دیکھ کر کوئی شخص یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو ابھی تین گھنٹے کے زوردار خطاب سے فارغ ہوا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا ایک بالکل تازہ دم

خطیب ہے جو بول رہا ہے۔

یہ ناشتہ کی مجلس تھی۔ مگر مولانا اپنی دعوت کی وضاحت میں اس قدر مستغرق تھے کہ انہوں نے ناشتہ کی جانب کوئی توجہ نہیں کی۔ ایک رفیق نے چائے کی پیالی پیش کی تو آپ نے پکڑ لی۔ دس پندرہ منٹ تک وہ یونہی پیالی ہاتھ میں پکڑے رہے اور پھر ایک شریک مجلس کے توجہ دلانے پر آپ نے وہ چلئے جواب پانی کی طرح ٹھنڈی ہو چکی تھی، حلق میں انڈیل لی۔ دوسری پیالی یہ کہہ کر پیش کی گئی کہ حضرت یہ گرم ہے، پی لیجئے اور یہ بسکٹ بھی تناول فرمائیے۔ مگر اللہ کے اس بندے نے اس پیالی کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ گفتگو میں مستغرق رہے اور ۱۰۔ ۱۵ منٹ بعد اسے بھی پانی کی طرح پی لیا۔

اس کے بعد اٹھے اور ایک دوسرے اجتماع میں تقریر کے لیے تشریف لے گئے۔ اور یہ پہلے سے معلوم تھا کہ دوپہر سے قبل ایک تیسرا اخطاب بھی کرنا ہے ۔۔ یہ کوئی استثنائی واقعہ نہیں ہے۔ بلکہ یہی آپ کی روزانہ کی زندگی تھی۔

مولانا کے ایک رفیق خاص راوی ہیں :

" میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ وہ تقریر شروع فرمانے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ اور مراقب ہوتے تھے اور اس کے بعد تقریر شروع فرماتے تھے اور پھر ان کو خود اپنی بھی خبر نہیں رہتی تھی۔ اب سے ۸۔ ۱۰ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ بھوپال میں اجتماع تھا۔ ان دنوں حضرت مولانا مرحوم کی ران میں ایک بہت بڑا زخم تھا جس کا حال یہ تھا کہ حرکت کرنے سے اور زور سے تقریر کرنے سے اس میں خون جاری ہو جاتا تھا۔ مولانا اسی حال میں بھوپال تشریف لائے اور اپنی عادت کے مطابق اجتماع میں تقریریں بھی فرمائیں۔ زخم کی تکلیف کافی بڑھ گئی۔ بھوپال سے فارغ ہونے کے بعد وہاں سے ۴۰۔ ۵۰ میل کے فاصلہ پر ایک اور اجتماع طے تھا۔ حضرت مولانا وہاں بھی تشریف لے گئے۔ لیکن طے یہ ہوا کہ یہاں مولانا تقریر نہیں فرمائیں گے۔ بلکہ فلاں ساتھی کی تقریر ہو گی۔ مگر ساتھی کی تقریر کے بعد مولانا کو احساس ہوا کہ دعوت، قوت کے ساتھ نہیں دی جاسکی تو اپنے اندرونی جذبے سے مغلوب ہو کر خود تقریر کے لیے اصرار فرمایا۔ حالت یہ تھی کہ بیٹھنے کے لائق بھی نہیں۔ چنانچہ لیٹ کر بولنا شروع کیا۔ ادھر زخم کی یہ حالت ہوئی کہ اس میں سے خون جاری ہو گیا۔ ایک کپڑا لگا دیا جاتا۔ جب وہ بالکل تر بتر ہو جاتا تو دوسرا کپڑا لگا دیا جاتا۔ اس طرح کئی کپڑے خون سے بھر گئے۔ اور مولانا نے عادت کے مطابق پوری تقریر فرمائی۔ اندازہ ہے کہ

اس تقریر کے دوران غالباً آدھا سیر خون مولانا کے جسم سے نکل گیا ہوگا۔ مگر اللہ کے اس بندے کو کچھ پتہ نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔"

گھر کے لوگ، خاص طور پر بیوی کو جتنی خبر کسی شخص کی ہوتی ہے، اتنی دوسروں کو نہیں ہو سکتی۔ مولانا کی اہلیہ جو اب مرحومہ ہو چکی ہیں دق کی مریض تھیں۔ اور آخر میں حالت کافی خراب ہو گئی۔ مگر مولانا کے اوقات میں ان کا حصہ بہت کم ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر ایک صاحب نے اپنی بیوی کو مولانا کی اہلیہ کے پاس بھیجا اور یہ بھی ہدایت کر دی کہ اس بارے میں تم ان سے اس طرح کی جذباتی باتیں کرنا کہ ان کے دل کی بات زبان پر آجائے اور اگر مولانا سے انہیں کوئی شکایت ہو تو ظاہر ہو جائے۔ چنانچہ راوی موصوف کی اہلیہ نے مرحومہ سے بات کی۔ ان کا بیان ہے کہ انہوں نے مولانا کی طرف سے خود مدافعت کی اور کہا کہ "وہ دن رات دین کی فکر اور دین کے کام میں لگے رہتے ہیں، انہیں اپنا بھی ہوش نہیں ہے۔ میں نے خود ہی ان سے کہہ دیا ہے آپ میری فکر بالکل نہ کریں دوا علاج ہو ہی رہا ہے۔ اگر اللہ نے جنت میں جمع فرما دیا تو وہاں اطمینان سے رہنے کا موقع ملے گا"۔ چند مہینوں کے بعد اسی مرض میں خاص نماز کی حالت میں مرحومہ کا انتقال ہو گیا۔

آپ کی دعوت

یہ تڑپ اور لگن کس کام کے لیے تھی۔ صرف اس لیے کہ لوگوں کے اندر دین کا صحیح تصور آجائے اور زندگیاں اس کے مطابق چل پڑیں۔ مولانا کے نزدیک ایمان کا مطلب ایک لفظ میں یہ تھا کہ ——— "اللہ سے سب کچھ ہوتا ہے، چیزوں سے کچھ نہیں ہوتا"۔ ایک مرتبہ فرمایا :

کام یہ ہے کہ کام کرنے والے کا اس ذات پر یقین قائم ہو جائے جس کے کرنے سے کام ہوگا۔ یعنی اللہ جل جلالہ کی ذات پر، اور اس کی حیثیت کام کرنے والے پر ایسی منکشف ہو کہ اپنی ذات اور کوئی دوسری ذات دکھائی نہ دے۔ دوسرا یقین یہ ہو کہ جب میں ظاہر و باطن سے حضورؐ کے طریقوں پر آجاؤں گا تو رب العزت دنیا و آخرت میں اچھے حالات لائے گا۔

ایک تقریر میں فرمایا :

"محنت کے دو میدان ہیں۔ ایک زمین اور زمین سے پیدا ہونے والی چیزیں۔ دوسرے ایمان اور ایمان والے اعمال۔ پہلی محنت کا معاوضہ دنیا میں ملتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ملتا کہ محنت کرنے والے اس پر خوش اور مطمئن ہوں۔ دوسری محنت کا معاوضہ دنیا و آخرت میں اللہ تعالے

بھرپور دے گا" مولانا کے نزدیک دنیوی غلبہ اسلامی زندگی کا ایک نتیجہ تھا۔ فرمایا:

"تم حضورؐ کے نمونے پر بننا شروع کردو۔ جتنا بننا ہوگا بن جائے گا اور جو بننے والا نہیں ہوگا اور بننے والوں کے لیے رکاوٹ بنے گا، خدا اسے اس طرح توڑ دے گا جیسے انڈے کے چھلکے کو توڑ دیتا ہے۔ تم جن کو بڑی طاقتیں کہتے ہو، خدا کے نزدیک ان کی حیثیت مکڑی کے جالے کے برابر بھی نہیں ہے۔ اس دنیا میں پاکیزہ انسانوں کے نہ ہونے کی وجہ سے مکڑیوں کے بڑے بڑے جالے لگ گئے تھے، جب حضورؐ کی سعی سے پاکیزہ انسان بن گئے تو خدا نے عذاب کی ایک جھاڑ دے روم و فارس کے جالے صاف کر دیے تھے۔ بالکل یہی صورت روس اور امریکہ کی ہوگی"

ایک طویل مکتوب کے چند فقرے یہ ہیں:

"اللہ نے انسانوں کی تمام کامیابیوں کا دار و مدار انسان کے اندرونی پایہ پر رکھا ہے۔ کامیابی اور ناکامی انسان کے اندر کے حال کا نام ہے ..... اللہ جل شانہ ملک و مال کے ساتھ انسان کو ذلیل کر کے دکھا دیں اور فقر کے نقشہ میں عزت دے کر دکھا دیں۔ انسان کے اندر کا یقین اور اندر سے نکلنے والے عمل اگر ٹھیک ہوں گے تو اللہ جل شانہ کامیابی کی حالت پیدا فرما دیں گے خواہ چیزوں کا نقشہ کتنا ہی پست کیوں نہ ہو ...... جو کچھ قدرت سے بنا ہے وہ قدرت کے ماتحت ہے .... ہر شکل پر خواہ ملک کی ہو یا مال کی، برق کی ہو یا بھاپ کی، ان کا ہی قبضہ ہے اور وہ ہی تصرف فرماتے ہیں۔ جہاں سے انسان کو تعمیر نظر آتی ہے وہاں سے تخریب لا کر دکھا دیں اور جہاں سے تخریب نظر آتی ہے وہاں سے تعمیر لا کر کے دکھا دیں۔ .... اللہ جل شانہ کی ذاتِ عالی سے تعلق پیدا ہو جائے اور ان کی قدرت سے براہِ راست استفادہ ہو، اس کے لیے حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے طریقے لے کر آتے ہیں۔ جب ان کے طریقے زندگیوں میں آئیں گے تو اللہ جل شانہ ہر نقشے میں کامیابی دے کر دکھائیں گے ...... آج امت میں کسی حد تک انفرادی اعمال کا رواج ہے گو ان کی حقیقت نکلی ہوئی ہے حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے طفیل پوری امت کو دعوت والی محنت ملی تھی اس کے بندوں کا تعلق اللہ جل شانہ سے قائم ہو جائے۔ اس کے لیے انبیاء علیہم السلام والے طرز پر اپنی جان و مال کو جھونک دینا اور جن میں محنت کر رہے ہیں ان سے کسی چیز کا طالب نہ بننا، اس کے لیے ہجرت بھی کرنا اور نصرت بھی کرنا ..... اس راستے میں محنت کرنے والوں

کی دعائیں بنی اسرائیل کے انبیاء علیہم السلام کی دعاؤں کی طرح قبول ہوتی ہیں یعنی جس طرح ان کی دعاؤں پر اللہ جل شانہ نے ظواہر کے خلاف اپنی قدرت کو استعمال فرما کر ان کو کامیاب فرمایا اور باطل خداؤں کو توڑ دیا اسی طرح اس محنت کرنے والوں کی دعاؤں پر اللہ جل شانہ ظواہر کے خلاف اپنی قدرت کے مظاہرے فرمائیں گے۔ اور اگر عالمی بنیاد پر محنت کی گئی تو تمام اہل عالم کے قلوب میں ان کی محنت کے اثر سے تبدیلیاں لائیں گے۔"

لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ "چیزوں میں سے چیزیں نکل رہی ہیں اور چیزوں میں سے اثرات وخواص ظاہر ہو رہے ہیں" مگر مولانا کے نزدیک انبیاء کے ذریعہ جو حقیقت انسانوں پر کھولی گئی ہے وہ یہ ہے کہ "جو کچھ چیزوں سے بنتا ہوا اور ظاہر ہوتا ہوا نظر آتا ہے، یہ چیزوں سے نہیں بنتا بلکہ اللہ تعالےٰ کے حکم سے اور امر سے بنتا ہے" اگر یہ حقیقت ذہنوں میں پوری طرح بیٹھ جائے تو مولانا کے الفاظ میں "بازار کے نقشوں سے اساس زندگی ہٹ کر دعاؤں پر آجاتی ہے اور بڑے سے بڑا اور مشکل سے مشکل مرحلہ خداوند قدوس کی قدرت کاملہ سے آسان سے آسان بن جاتا ہے" مولانا کی تقریریں جن لوگوں نے سنی ہیں وہ جانتے ہیں کہ مولانا کا سب سے زیادہ زور اس حقیقت کو ذہن نشین کرانے پر ہوتا تھا کہ محنت اور کوشش کا اصل میدان کیا ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زراعت، تجارت، ملازمت وغیرہ محنت کے میدان ہیں۔ اسی طرح اجتماعی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے لوگ جن چیزوں پر انحصار کرتے ہیں وہ الکشن اور حکومت پر اثر ڈالنے اور اس پر قبضہ کرنے کی دوسری کوششیں ہیں۔ مگر مولانا کا کہنا تھا کہ یہ چیزیں مثل بجلی کے بلب اور پنکھے کے ہیں۔ بلب اور پنکھے پر عمل کر کے ہم نہ انہیں روشن کر سکتے ہیں اور نہ انہیں چلا سکتے ہیں، بلکہ اس کے لیے بجلی کے بٹن تک ہاتھ پہونچانے کی ضرورت ہے، اسی طرح اگر خدا سے تعلق پیدا ہو جائے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اور اگر تعلق پیدا نہ ہو تو ساری کوششیں کے باوجود کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

طریق کار

اس مقصد کے لیے مولانا کا طریق کار نہایت سادہ تھا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مسجدوں کو ان کے اعمال کے ساتھ زندہ کرنے کی کوشش۔ گشت اور سفر جس پر مولانا بہت زور دیتے تھے، اس کا مقصد بھی حقیقۃً آدمی کو "مسجد والا" بنانا تھا۔ اس کا فلسفہ یہ تھا کہ لوگوں کو ان کی روزمرہ کی دنیوی مصروفیتوں سے نکال کر کچھ دنوں کے لیے ایک خاص طرح کی دینی

فضا میں رکھا جائے ۔ جب کہ آدمی عبادات واذکار میں وقت گزارے دوسروں کو دینی زندگی اختیار کرنے کی تلقین کرے ، اور اس طرح تربیت یافتہ ہو کر جب اپنے وطن واپس آئے تو آئندہ مسجد والی زندگی میں مصروف ہو جائے ۔ مسجد والی زندگی ہی مولانا کے نزدیک دنیا و آخرت کی کامیابی کی ضامن تھی۔

ایک جماعت کے نام خط میں اس طرح طریق کار کی وضاحت فرماتے ہیں :

"دین سے مناسبت پیدا کرنے کے لیے ہر شخص سے خواہ کسی شعبہ سے متعلق ہو، چار ماہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے ۔ اپنے مشاغل ، ساز و سامان اور گھر بار سے نکل کر ان چیزوں کی دعوت دیتے ہوئے اور خود مشق کرتے ہوئے ملک بہ ملک ، اقلیم بہ اقلیم ، قوم بہ قوم ، قریہ بہ قریہ پھریں گے ۔ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے ہر امتی کو مسجد والا بنایا تھا ۔ مسجد کے کچھ مخصوص اعمال دیئے تھے ۔ مسجد میں اللہ کی بڑائی کی ، ایمان کی اور آخرت کی باتیں ہوتی تھیں ، اعمال سے زندگی بننے کی باتیں ہوتی تھیں ، عملوں کے ٹھیک کرنے کی تعلیمیں ہوتی تھیں ۔ ایمان و عمل صالح کی دعوت کے لیے ملکوں اور علاقوں میں جانے کی تشکیلیں بھی مسجد ہی سے ہوتی تھیں ۔ اللہ کے ذکر کی مجلسیں مسجدوں میں ہوتی تھیں ۔ یہاں تعاون ، ایثار ، ہمدردیوں کے اعمال ہوتے تھے ، ہر شخص حاکم ، محکوم ، مالدار ، غریب ، تاجر ، زارع ، مزدور ، مسجد میں آکر زندگی سیکھتا تھا ۔ اور باہر جا کر اپنے اپنے شعبہ میں مسجد والے تاثر سے چلتا تھا ۔ آج ہم دھوکے میں پڑ گئے کہ ہمارے پیسے سے مسجد چلتی ہے ۔ مسجدیں اعمال سے خالی ہو گئیں اور چیزوں سے بھر گئیں ۔ حضور صلعم نے مسجد کو بازار والوں کے تابع نہیں کیا حضور صلعم کی مسجد میں نہ بجلی تھی ، نہ پانی تھا ، نہ غسل خانے تھے ، خرچ کی کوئی شکل نہ تھی ۔ مسجد میں آکر داعی بنتا تھا ، معلم اور متعلم بنتا تھا ، ذاکر بنتا تھا ۔ نمازی بنتا تھا ، مطیع بنتا تھا ، متقی زاہد بنتا تھا ، خلیق بنتا تھا ، باہر جا کر ٹھیک زندگی گزارتا تھا ۔ مسجد بازار والوں کو چلاتی تھی ۔ ان چار ماہ میں ہر جگہ جا کر مسجدوں میں ہر امتی کو لانے کی مشق کریں مسجد والے اعمال کو سیکھتے ہوئے دوسروں کو یہ محنت سیکھنے کے لیے تین چلوں کے واسطے آمادہ کر دیں ۔ واپس اپنے مقام پر آکر اپنی بستی کی مسجد میں ان اعمال کو زندہ کرنا ہے ، ہفتہ میں دو مرتبہ گشت کے ذریعہ بستی والوں کو جمع کر کے انہیں چیزوں کی طرف متوجہ کرنا اور مشق کے لیے فی گھر ایک نفر تین چلوں کے لیے باہر نکلنا ہے ۔ ایک گشت اپنی مسجد کے ماحول میں اور دوسرا گشت دوسری مسجد کے ماحول میں کریں ۔ ہر مسجد میں مقامی جماعت بھی بنائیں ہر مسجد کے احباب روزانہ

فضائل کی تعلیم کریں۔ اپنے شہر یا بستی کے قریب دیہات میں کام کی فضا بنے، اس کے لیے ہر مسجد سے تین یوم کے لیے جماعتیں پانچ کوس کے علاقے میں جائیں۔ ہر دوست مہینے میں تین یوم پابندی سے لگائے۔ الحسنة بعشر امثالها کے مصداق تین دن پر حکماً تیس دن کا ثواب ملے گا۔ پورے سال ہر مہینے تین دن لگائے تو سارا سال اللہ کی راہ میں شمار ہوگا۔"

اشاعت سے پرہیز

مولانا اشاعت کے عام طریقوں کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"اس کام کی تعمیم کے لیے رواجی طریقوں۔ اخبار، اشتہار پریس وغیرہ اور رواجی الفاظ سے بھی پورے پرہیز کی ضرورت ہے۔ یہ کام سارا کا سارا غیر رواجی ہے۔ رواجی طریقوں سے رواج کو تقویت پہونچے گی اس کام کو نہیں۔ اصل کام کی شکلیں، دعوت، گشت، تعلیم تشکیل وغیرہ ہیں۔"

مولانا کے ذہن میں لٹریچر کا جو تصور تھا اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے ہوتا ہے:

"فضائل قرآن مجید پڑھ کر تھوڑی دیر کلام پاک کی ان سورتوں کی تجوید کی مشق کی جائے جو عموماً نمازوں پر پڑھی جاتی ہے۔ اللہ پاک توفیق دیں تو ہر کتاب میں سے تین چار صفحے پڑھے جائیں۔ تعلیم میں اپنی طرف سے تقریر نہ ہو۔ حدیث شریف پڑھنے کے بعد دو تین جملے ایسے کہہ دیے جائیں کہ اس سے عمل کا جذبہ ابھر آئے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم کی تالیف فرمودہ فضائل قرآن مجید، فضائل نماز، فضائل تبلیغ، فضائل ذکر فضائل صدقات حصہ اول دوم، فضائل رمضان، فضائل حج، (ایام حج در رمضان میں) اور مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی دام مجدہٗ کی (مسلمانوں کی موجودہ پستی کا واحد علاج) صرف یہ کتابیں ہیں جن کو اجتماعی تعلیم میں پڑھنا اور سننا ہے اور تنہائیوں میں بیٹھ کر بھی ان کو پڑھنا ہے۔"

اشاعت سے پرہیز کا یہ عالم تھا کہ آپ کی وفات کے بعد آپ کے مکاتیب کی تلاش میں ایک صاحب نے دہلی کا سفر کیا۔ مگر وہاں ایک مکتوب کی نقل بھی محفوظ نہیں مل سکی۔ حالانکہ آپ کثرت سے خطوط لکھتے تھے۔

غیر مسلموں میں تبلیغ

غیر مسلموں میں تبلیغ کے بارے میں مولانا کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جب تک مسلمانوں میں دینی

زندگی پیدا نہ ہو، اغیار میں دین کے لیے کشش پیدا نہیں ہوسکتی۔ ایک دفعہ فرمایا:

"جب تک یقین اور علم نبوت کے مطابق عبادات درست نہ ہوجائیں، اخلاق نہیں آتے اور جب تک ہم میں اخلاق نہیں آئیں گے دوسروں میں دین نہیں پھیلے گا۔ اغراض کے لیے کسی سے سلوک کرنا اخلاق نہیں ہے بلکہ کوئی کام بھی جب تک اس میں اخلاص نہ ہو اس کی قطعاً کوئی قیمت نہیں ہے عمل اخلاص کے بغیر مردہ ہے اور دیکھو، گھروں، بازاروں، دفتروں، یہاں تک کہ مدارس و مساجد میں بھی ایسے مرداروں کے ڈھیر لگ رہے ہیں۔"

اسی لیے آپ کم از کم پہلے مرحلہ میں اصلاح و تبلیغ کی زیادہ تر کوشش مسلمانوں پر صرف کرنا ضروری سمجھتے تھے۔

اجتماعیت

مولانا اجتماعیت کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ اپنے رفقاء کو آپ کی ہدایت ہوتی تھی کہ "ہر کام کو اجتماعی کریں۔ حتیٰ کہ سفر میں بھی یکجا رہنے کی بھرپور کوشش کریں۔" مگر اجتماعیت کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر عام تصور سے کچھ مختلف تھا۔ اس کو ہم شاید اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ آپ کے نزدیک اجتماعیت کی اہمیت تھی مگر جماعت بندی کی نہیں۔ فرماتے ہیں:

"ہم نے اس کام کے لیے کوئی انجمن نہیں بنائی۔ نہ اس کا کوئی دفتر ہے نہ رجسٹر ہے نہ فنڈ ہے یہ سارے ہی مسلمانوں کا کام ہے ہم نے مروجہ طریقہ پر کوئی علٰحدہ جماعت بھی نہیں بنائی ہے۔ جس طرح مسجد میں نماز کے عمل پر مختلف طبقوں اور مشغلوں والے مسلمان آکر جُڑ جاتے ہیں اور نماز سے فارغ ہوکر اپنے اپنے گھروں اور مشغلوں میں چلے جاتے ہیں اسی طرح ہم آپ سب سے کہتے ہیں کہ کچھ وقت کے لیے اپنے گھروں اور مشغلوں سے نکل کر یہ محنت اور مشق کر لیجیے۔ اور پھر اپنے گھروں اور مشغلوں میں آکر ان اصولوں کے مطابق لگ جائیے ——— آپ نے اگر یہ چیز محنت کرکے حاصل کر لی تو دنیا بھر کے سائنس والے آپ سے یہ طریقہ سیکھنے آئیں گے اور خدا نے چاہا تو آپ دنیا کے امام ہوں گے۔"

حکمتِ تبلیغ

ایک تقریر میں تبلیغی کارکنوں کو ہدایات دیتے ہوئے فرمایا:

خصوصی گشت میں اگر دیکھا جائے کہ وہ صاحب جن سے آپ ملنے گئے ہیں اس وقت توجہ سے بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں تو مناسب طریقہ سے جلدی سے بات ختم کرکے ان کے پاس سے اُٹھ آنا چاہیے۔ اور ان کے لیے دعا کرنی چاہیے اور اگر دیکھا جائے کہ وہ صاحب متوجہ ہیں تو پھر پوری بات ان

کے سامنے رکھنی چاہیئے .... خصوصی گشت میں جب دینی اکابر کی خدمت میں حاضری ہو تو ان سے صرف دعا کی درخواست کی جائے اور ان کی توجہ دیکھی جائے تو کام کا کچھ ذکر کر دیا جائے۔"

دعا

مولانا کی تقریروں کا خاتمہ ہمیشہ دعا پر ہوتا تھا۔ لفظ "دعا" اپنے عام استعمالی مفہوم کے لحاظ سے شاید اس کی کیفیت کو ادا کرنے سے قاصر ہے جو مولانا کی دعاؤں میں ہوتی تھی۔ مولانا کی دعوت کا اصل اور مغز اللہ سے استعانت اور دعا کا تعلق پیدا کرنا تھا۔ اور یہ چیز ان کی دعاؤں میں اس طرح ابھر آتی تھی کہ اس وقت وہ اپنی دعوت کا مجسم نمونہ بن جاتے تھے۔ ایک واقف حال کے الفاظ میں "جب دعا کرتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ نہ اس سے پہلے دعا کی ہے نہ اس کے بعد کریں گے۔ سب کچھ اسی دعا میں مانگ لینا ہے اور سب کچھ اسی دعا میں کہہ دینا ہے۔" مولانا کی دعا کی کیفیت، اس کے مضامین، اس کی آمد اور جوش و خروش اس کی رقت انگیزی اور اس کی تاثیر مولانا کے ان خصائص میں سے تھی جن کی مثال دور دور دیکھنے میں نہیں آتی۔ جب دعا کرتے، حاضرین کا عجیب حال ہوتا۔ خاص طور پر جب اردو میں دعا کے الفاظ ادا فرماتے تو آنسوؤں کا سیلاب امنڈ پڑتا۔ دور دور سے رونے والوں کی ہچکیاں سننے میں آتیں۔"

ایک صاحب جو ایک اجتماع میں شریک تھے، لکھتے ہیں:

"مولانا محمد یوسف صاحب نے دعا کی۔ اپنے گناہوں کی توبہ، مغفرت، آخرت کی سرخروئی، دین کی عظمت، تمام انسانوں کے لیے ہدایت طلبی، یہ سب باتیں اللہ سے طلب کی گئیں۔ دعا یوں مانگی گئی جس طرح مانگنے کا حق ہوتا ہے۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو روئی نہ ہو کوئی زبان نہ تھی جو ہلی نہ ہو، کوئی دل نہ تھا جو پھٹ پڑنے پر نہ آیا ہو۔ بس ایک ہی احساس تھا کہ اتنی زندگی جو گزری ناکامی میں گزری۔ میں ہی سراپا معصیت ہوں۔ سب برائیاں مجھ ہی میں ہیں۔ اے اللہ ان سب کوتاہیوں کو معاف فرما اور میری زندگی کو اپنے راستے پر لگا دے۔"

ایک دعا جو اتفاق سے ٹیپ ریکارڈر کے ذریعہ محفوظ ہو گئی ہے، اس کے چند الفاظ یہ ہیں:

اے اللہ ہمارے گناہوں کو معاف فرما..... اے خدا ہماری محنت کے بگڑ جانے کے اس جرم عظیم کو معاف فرما جس جرم عظیم سے ہزاروں خرابیاں ہم میں پیدا ہو گئی ہیں، محمد صلے اللہ علیہ وسلم جس محنت پر ڈال کر گئے اس محنت کو چھوڑ کر ہم ان محنتوں میں الجھ گئے جن محنتوں سے وہ نکال کر گئے تھے ...... اے اللہ ہمیں عصیاں کے دریاؤں سے نکال دے اور ہمیں طاعت کی سڑکوں پر ڈال دے ...

اے خداوند قدوس جس قسم کے زمانے میں تو نے اس تبلیغ کے ذریعے اس کلمہ و نماز پر محنت کی دولت پیدا فرمادی اور اپنی راہ میں نکلنے کی توفیق دی ..... اے رب کریم اپنے کرم سے سب کو قبول فرمالے اور ان سب کی ایسی تربیت فرما کہ یہ نقل و حرکت تجھے پسند آجائے ..... اے اللہ درندوں کی اور اژدہوں کی قسم سے جتنے انسان اور درندے ہیں اور جن کو تجھے انسانیت سے نوازنا ہی نہیں، اے خدا ایسے ایسوں کو چن چن کر ہلاک فرما۔ ایسوں کی زمینوں کو، ان کے لیے پھاڑ دے، ایسوں کے مکانوں کو ان پر توڑ دے۔ ایسوں سے نعمتوں کو اپنی چھین لے ..... اے خدا لوٹ کھسوٹ کے ماحول کو ختم کر، ظلم و ستم کے ماحول کو ختم کر، عدل و انصاف کے ماحول کو قائم کر، علم و ذکر کے ماحول کو قائم کر، خدمتِ خلق کے ماحول پیدا کر تعاون و ہمدردی و محبت کے ماحول کو قائم کر..... اے اللہ ہماری دعاؤں کو اپنے فضل و کرم سے قبول فرما۔

مقبولیت

مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی زندگی ہی میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ بجنور کے ایک اجتماع کے مشاہد فرماتے ہیں —— "اس میں حضرت مولانا اپنے تمام رفقاء کے ہمراہ تشریف لائے تھے، عقیدت مندوں کے ہجوم نے بڑی دشواری پیدا کر دی۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح مولانا سے مصافحہ کر لوں۔ انتظاماً قیام گاہ پر بعض میواتیوں کا پہرہ لگانا پڑا۔ پھر بھی قیام گاہ کے دروازہ کی چوکھٹ، داخلے کی بے محابا کوشش کرنے والے کی وجہ سے اکھڑ گئی۔ جب مولانا قیام گاہ سے جلسہ گاہ میں تشریف لاتے مجمع آپ کے گرد سمندر کی طرح موجیں مارتا ہوا نظر آتا۔"

مولانا شیخ طریقت بھی تھے۔ بیعت چاروں سلسلوں میں اپنے والد ماجد صاحب کے واسطے سے کرتے تھے۔ ایک صاحب رائے ونڈ کا حال بیان کرتے ہیں۔ "ایک کثیر مجمع نے بیعت کی۔ بیعت کرنے والوں کے ہاتھوں میں پگڑیاں اور چادریں وغیرہ تھیں اور اتنا کثیر مجمع تھا کہ کئی حضرات مکبر کی طرح پکار پکار کر الفاظ بیعت کو بیعت کرنے والوں تک پہونچا رہے تھے۔ عجیب دل کش منظر تھا۔ میرے ایک عزیز کہنے لگے کہ آج تو حضرت جی نے امام شہید (سید احمد صاحب رائے بریلوی) کی یاد تازہ کر دی۔"

تقریر

مولانا کو تقریر کا عجیب و غریب ملکہ تھا جو کچھ وہبی تھا اور کچھ ان کے دعوتی جذبہ نے ان کے اندر پیدا کر دیا تھا۔ ایک عالم کے الفاظ میں آپ کی تقریروں کو سن کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ "آپ کو اللہ

کی طرف سے ایک علم عطا ہوا ہے (جو مدرسہ اور کتب خانہ کا علم نہیں ہے) اور اسی کا نام حکمت ہے اور قوت بیان مزید برآں ہے۔ بعض قریبی لوگوں کا اندازہ ہے کہ آخر میں مجموعی طور پر آٹھ آٹھ گھنٹے تک بولنے کی نوبت آتی تھی۔ عجیب بات یہ ہے کہ سننے والے خواہ وہ جاہل ہوں یا عالم آپ کی تقریریں سننے سے گھبراتے نہیں تھے بلکہ پوری تقریر کے دوران ہمہ تن گوش بنے رہتے تھے۔ اور ایک کثیر تعداد کا یہ عالم ہوتا تھا کہ شدت پسندیدگی میں وہ کاغذ قلم لے کر اس کو دوران تقریر ہی میں نوٹ کرنا شروع کر دیتے تھے۔ آپ تقریر پر تقریر کرتے رہتے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ہر بعد کی تقریر میں نئے سننے والوں کو یہ اندازہ ہوتا کہ بولنے والا اسی وقت بولنے کھڑا ہوا ہے اور اس سے پہلے اس کو اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس موقع پر اپنا دل کھول کر رکھ دینا چاہتا ہے۔"

ایک صاحب مولانا کے ایک سفر کی روداد بیان کرتے ہیں۔ ہر جگہ جہاں آپ کا جانا ہوا "صبح و شام گھنٹوں خطاب فرماتے رہے۔ بولتے بولتے گلے میں سوجن پڑ گئی۔ ڈاکٹروں نے اصرار سے مشورہ دیا کہ کچھ دنوں کے لیے بولنا چھوڑ دیا جائے۔ مگر حضرت مولانا اس پر آمادہ نہیں ہوئے۔ حسب عادت تقریروں اور گفتگوؤں کا سلسلہ جاری رہا اور مرض ترقی کرتا گیا۔

تقریر کا انداز بھی عجیب تھا۔ بات کرتے کرتے آستین چڑھاتے پھر اتارتے۔ بیٹھ کر تقریر شروع کرتے اور پھر درمیان میں کھڑے ہو جاتے۔ کبھی درمیان کلام میں ایک آہ بھرتے جو درد و اثر میں ڈوبی ہوئی عجیب کیفیت پیدا کر دیتی۔ ایک صاحب فرماتے ہیں:

"حضرت جی گھنٹوں مسلسل بیان کرتے رہتے تھے بندہ نے خود ایک دن میں حضرت کے پانچ بیان سنے ہیں۔ جن میں سے ایک ساڑھے پانچ گھنٹے کا تھا۔ یہاں علوم اندر سے پھوٹ کر نکلتے تھے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ آپ نہیں کہہ رہے ہیں کہلوایا جا رہا ہے۔ علوم الٰہیہ کا فیضان موسلا دھار بارش کی طرح حضرت کے قلب پر ہوتا تھا۔"

ذوق علم

آپ کے علمی ذوق کے بارے میں آپ کے ایک قریبی واقف کار روایت کرتے ہیں کہ ایک بار مولانا نے فرمایا ـــــ "میں نے سوا ایک دفعہ کے بازار سے ایک آنہ کی بھی مٹھائی خرید کر نہیں کھائی یہ وجہ نہ تھی کہ میرے پاس پیسے نہ ہوتے تھے، بلکہ بات یہ تھی کہ میں نے پیسے جمع کرنے کا ایک ڈبہ بنایا تھا اور اس میں جو پیسے مجھ کو ملتے ڈال دیا کرتا تھا کہ ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی کتابیں خریدوں گا تعلیم کے زمانے میں مولانا انعام الحسن صاحب آپ کے ساتھی اور ہم سبق تھے۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ

"ہم دونوں نے آپس میں یہ طے کر لیا تھا کہ رات کے ابتدائی آدھے حصے میں ہم میں سے ایک مطالعہ کرے گا اور دوسرا سوئے گا۔ اور آدھی رات ہو جانے پر مطالعہ کرنے والا چائے بنائے گا اور دوسرے ساتھی کو اٹھا کر اور اس کے ساتھ چائے پی پلا کر سو جائے گا اور اسی دوسرے کے ذمہ ہو گا کہ فجر کی جماعت کے لیے سونے والے ساتھی کو اٹھائے۔ ایک دن مولانا مرحوم شروع رات میں مطالعہ کرتے تھے اور میں سوتا تھا۔ اور دوسرے دن برعکس ترتیب رہتی تھی۔"

بستی نظام الدین کی زندگی میں آپ کا معمول تھا کہ روزانہ ایک خاص وقت میں آپ اپنے مطالعہ کے کمرے میں چلے جاتے اور وہاں مقرر وقت تک مطالعہ اور تحریر کا سلسلہ جاری رہتا۔

زبان

کسی تحریک کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی ایک زبان پیدا کرتی ہے۔ مولانا یوسف صاحب نے بھی تبلیغی تحریک کو ایک مخصوص زبان اور طرز ادا دیا جو اس طرح رائج ہوا کہ ہزاروں افراد کی زبان سے بے تکلف ادا ہونے لگا۔ مثلاً مسجد میں تبلیغی جماعت کا اجتماع ہو رہا ہے اس میں شرکت کی دعوت دینی ہے تو اس طرح کہیں گے۔ "بھائی مسجد میں کچھ فکر کی بات ہو رہی ہے، آؤ وہاں چلیں" مولانا یوسف صاحب ایک مکتوب میں لکھتے ہیں —— "جب محلوں کی مساجد میں ہفتوں کی دو گشتوں کے ذریعہ فی گھر ایک آدمی تین چلے کے لیے نکلنے کی آواز لگ رہی ہو گی۔ تعلیموں اور تسبیحات پر احباب جڑ رہے ہوں گے۔ ہر مسجد سے تین دن کے لیے جماعتیں نکالنے کی کوششیں ہو رہی ہوں گی تو شب جمعہ کا اجتماع صحیح نہج پر ہو گا اور کام کے بڑھنے کی صورتیں بنیں گی ..... مشورے سے ایسے احباب سے عموماً دعوت دلوائی جائے جو محنت کے میدان میں ہوں اور جن کی طبیعت پر کام کے تقاضے غالب ہوں بہت ہی فکر و اہتمام سے تشکیلیں کی جائیں۔ اگر اوقات وصول نہ ہوں تو رات کو بھی محنت کی جائے، رو رو کر مانگا جائے ...... تمام انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے زمانے میں کسی نہ کسی نقشے کے مقابلہ پر آئے اور بتایا کہ کامیابی کا اس نقشہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں "جزیرۂ عرب کو دین حیات کے لیے جان کھپانے کا مرکز قرار دے کر اس میں طریقۂ جہد کے سیکھنے سکھانے کا رواج ڈال کر ہر طرف دین حیات کے لیے ٹھوکریں کھانے کے لیے مقامی احباب کے ساتھ مل کر روانہ کرنے کا رُخ ڈالا جائے ...... تین تین چلہ کی جم کر دعوت دیں ...... عزیز با روکس میرس طبقات میں کام کا ضرور پھیر ڈالیں۔"

اپنے شہر یا بستی کے قریب دیہات میں کام کی فضا بنے اس کے لیے ہر مسجد سے تین یوم کے لیے جماعتیں

پانچ پانچ کوس کے علاقے میں جائیں"۔ ماہ رمضان کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: "کیا ہی اچھا ہو کہ اس مبارک زمانہ میں تین تین چلوں کے لیے تشکیل کر کے جماعتیں روانہ کی جائیں تاکہ ارکانِ اسلام کی حیات والی محنت کا حساب اس ماہ میں قائم ہو۔ اور اس ماہ میں چلہ کے لیے نکلنے کی برکت سے زیادہ وقت کے لیے اللہ رب العزت کے راستہ میں رواج پڑ جائے"۔

یہ نمونہ کے چند ٹکڑے ہیں۔ اسی طرح مولانا نے ایک مستقل تبلیغی زبان پیدا کی جس کے اندر سادگی کے ساتھ گہرائی اور تحریکی شدت کے ساتھ مٹھاس کی عجیب وغریب آمیزش تھی۔

آخر میں ایک واقعہ پر اس گفتگو کو ختم کروں گا۔ ندوہ کے ایک عالم نے مجھ سے بیان کیا ایک جلسہ میں مولانا یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر ہو رہی تھی۔ پورے مجمع پر مسحور کن خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مقرر حکمت و معرفت کی بارش برسا رہا تھا۔ جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی اس جلسہ میں موجود تھے۔ راوی کا بیان ہے کہ ایک موقع پر جب کہ تقریر اپنے عروج پر تھی۔ مولانا کی زبان سے بے اختیار نکلا ـــــ "اگر میں قسم کھاؤں تو میں حانث نہیں ہوں گا کہ اس وقت پورے عالم اسلام میں اس درجہ یقین و ایمان کے ساتھ بولنے والا کوئی دوسرا شخص موجود نہیں ہے"۔ (۱۳۸۶ھ)

اعلان

اوپر جو مضمون نقل کیا گیا ہے وہ تقریباً ۲۰ سال پہلے لکھا گیا تھا۔ اس طرح کے اور بھی کچھ قدیم مضامین ہیں۔ ان تمام مضامین کا مجموعہ ایک کتاب کی صورت میں شائع ہو گیا ہے جس کا نام "تبلیغی تحریک" ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی اس کا انگریزی اڈیشن بھی شائع کیا جائے گا۔

ادارۂ الرسالہ

بمبئی میں

اجتماع

مولانا وحیدالدین خاں صاحب ، صدر اسلامی مرکز

انشاءاللہ ۱۵ مئی ۱۹۸۵ کی صبح کو بروز بدھ

بمبئی پہونچیں گے

بمبئی میں ۱۸ مئی تک مولانا موصوف کا قیام رہے گا۔ اس دوران میں (۱۵ تا ۱۶ مئی) مولانا موصوف بمبئی کے مختلف مقامات پر خطاب کریں گے۔ بمبئی میں موصوف کا قیام جامعہ اصلاح البنات (ڈونگری) میں ہوگا۔

تفصیلی پروگرام اور معلومات پتہ ذیل سے حاصل کریں۔

ہارون ٹریڈنگ کمپنی — ۱۱ بھاجی پالا لین — بمبئی ۳

فون نمبر: آفس 335423

رہائش گاہ 8515413

۱. ۱۷ مارچ ۱۹۸۵ کو دہلی ٹیلی وژن پر اردو خطاطی کا ایک پروگرام دکھایا گیا۔ اس موقع پر اردو ٹائٹل کے چند منتخب نمونے دکھائے گئے۔ ان میں سے ایک "پیغمبر انقلاب" کا ٹائٹل بھی تھا۔ مشہور خطاط اور آرٹسٹ جناب خلیق ٹونکی صاحب نے اس کے فنی پہلوؤں کی وضاحت کی۔

۲. ۲۴ فروری کو مہینہ کا آخری اتوار تھا۔ حسب معمول بعد نماز مغرب ماہانہ درس قرآن کا اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے صبر کی چند آیات کی روشنی میں دین میں صبر کی اہمیت بتائی۔ صدر اسلامی مرکز نے بتایا کہ دنیا اور آخرت کی تمام کامیابیوں کا راز صبر ہے۔ یہ بات قرآن میں نہایت واضح ہے۔ مگر صبر ہمیشہ اپنے آپ کو نظامنے کی قیمت پر ہوتا ہے۔ لوگ چونکہ یہ قیمت دینا نہیں چاہتے اس لئے وہ صبر کا طریقہ بھی اختیار نہیں کرتے۔ درس کی اہمیت کی بنا پر کچھ لوگوں نے یہ تجویز کیا کہ ہر ماہ اخبار میں درس کا اعلان کیا جائے تاکہ زیادہ لوگ اس سے مستفید ہو سکیں۔

۳. درس قرآن میں شرکا کا دائرہ بڑھتا جا رہا ہے۔ اب باہر کے لوگ بھی اپنے سفر کی ترتیب اس طرح بنانے لگے ہیں کہ وہ دہلی آئیں تو ماہانہ درس قرآن میں بھی شریک ہو سکیں۔ ۲۴ فروری کے اجتماع میں راجستھان کے ایک صاحب شریک ہوئے۔ وہ اپنے ساتھ ٹیپ ریکارڈر لائے تھے۔ مذکورہ درس قرآن کو ٹیپ کر کے لے گئے۔ اسی طرح ۲۶ جنوری کے اجتماع میں جناب سلیمان سیٹھ (ایم پی) نے مع اپنے ساتھیوں کے شرکت فرمائی۔

۴. بعض شہروں میں حلقہ الرسالہ کے افراد یہ کر رہے ہیں کہ نقشہ بنا کر وہ ایک ایک شخص سے ملتے ہیں اور الرسالہ کا تعارف کراتے ہیں۔ اس طرح کافی لوگ الرسالہ کے خریدار بن رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ انفرادی اپروچ کا یہ طریقہ ہر جگہ اختیار کیا جائے۔

۵. مدینہ ٹکنیکل کالج (حیدر آباد) ایک قدیم تعمیری ادارہ ہے۔ اس نے اپنی سالانہ تقریب کے موقع پر ایک سوونیر شائع کیا تھا۔ اس پر انھوں نے صدر اسلامی مرکز سے پیغام بھیجنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس سلسلہ میں ان کو جو تحریری پیغام بھیجا گیا تھا وہ عمومی افادہ کے پیش نظر زیر نظر اشاعت میں "پیغام" کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔

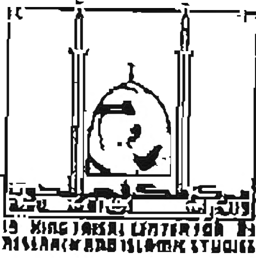
۶. بہت سے لوگ اپنے دل میں یہ تڑپ لئے ہوئے تھے کہ کوئی ایسا میگزین ہو جس میں اسلام

کی دعوت خالص مثبت انداز میں اور موثر اسلوب میں پیش کی گئی ہو تاکہ وہ اسے اطمینان کے ساتھ غیر مسلموں کے ہاتھ میں دے سکیں۔ ایسے لوگوں کے لئے انگریزی الرسالہ ایک نعمت ثابت ہوا ہے۔ وہ اس کو مسرت کے ساتھ غیر مسلموں تک پہنچا رہے ہیں۔ سعودی عرب سے ہم کو ایک خط موصول ہوا ہے۔ مکتوب نگار لکھتے ہیں کہ وہ ایک اسپتال میں کام کرتے ہیں۔ اس اسپتال میں فلپائن کی ایک خاتون نے اسلام قبول کر لیا۔ مکتوب نگار نے طے کیا کہ وہ مذکورہ خاتون کو ایک اسلامی تحفہ پیش کریں۔ اس لئے انھوں نے الرسالہ کا انتخاب کیا۔ انھوں نے مذکورہ نومسلمہ کا پتہ اور سالانہ زر تعاون بھیجتے ہوئے لکھا ہے کہ میری طرف سے ان کو انگریزی الرسالہ ایک سال کے لئے جاری کر دیا جائے۔

الرسالہ کس طرح لوگوں کے ذہن کو بیدار کر رہا ہے۔ اس کا اندازہ ایک خط سے ہوگا۔ ایک صاحب مالیگاؤں سے لکھتے ہیں: میں باقاعدگی سے ہر ماہ الرسالہ خرید کر پڑھتا ہوں۔ اس کے تمام مضامین ہمیشہ کچھ نہ کچھ سبق اور نصیحت دیتے ہیں۔ الرسالہ کے کسی مضمون کو پڑھنے کے بعد اگر آدمی میں ذرا سی بھی عقل ہو تو اس کو اپنی زندگی کا مقصد مل جائے گا۔ وہ خود بخود دیکھ جائے گا کہ اسے دنیا میں کس طرح رہنا ہے۔ الرسالہ کے ذریعہ دین اسلام کی جو اشاعت کی جا رہی ہے وہ لائق تحسین ہے۔ ابھی مجھ کو فروری ۱۹۸۵ کا شمارہ ملا۔ اس میں "یہ حلوثات کیوں" پڑھ کر میں سوچنے لگا کہ نہ جانے کتنی بار ٹرین سے سفر کر چکا ہوں۔ ہر بار اس کی روانگی سے پہلے سیٹی کی آواز سنی ہے۔ مگر کبھی میرے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ اس سیٹی کو فطرت کے الارم سے بھی تشبیہ دے سکتے ہیں۔ یہ بات صرف آپ جیسے اعلیٰ ذہن رکھنے والی شخصیت ہی سوچ سکتی ہے۔

انگریزی الرسالہ کے سلسلے میں ہم کو تقریباً روزانہ خطوط مل رہے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملک کے اندر اور ملک سے باہر خدا کے فضل سے اس کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ حال میں ہم کو مرکز الملک فیصل للبحوث والدراسات الاسلامیہ (ریاض) کا خط مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۸۴ موصول ہوا ہے۔ یہ ادارہ عالم اسلام کے انتہائی بڑے اداروں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے ڈائرکٹر جنرل نے الرسالہ (انگریزی) سے دل چسپی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ان کے ادارہ کو مستقل طور پر روانہ کیا جائے۔ نیز پچھلے تمام شمارے بھی ان کو فراہم کئے جائیں تاکہ ان کو ادارہ کی لائبریری میں محفوظ کیا جا سکے۔ اس خط کا عکس بالمقابل صفحہ پر دیا جا رہا ہے۔

بسم الله الرحمن الرحيم



مركز الملك فيصل للبحوث والدراسات الإسلامية

KING FAISAL CENTER FOR RESEARCH AND ISLAMIC STUDIES

December 24, 1984

The Editor
Maktaba Al-Risala
C 29 Nizamuddin West
New Delhi 110 013

Subject: AL-RISALA

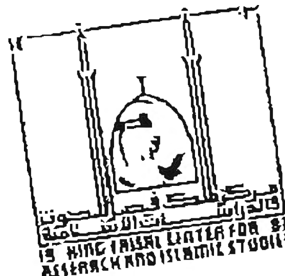
Dear Sir,

I have great pleasure in informing you that the King Faisal Centre for Resarch and Islamic Studies has recently been established. The Centre's library facilities are very extensive and its bibliographic holdings will cover not only all subjects relevant to Islamic civilization in all its aspects, but will extend to the pricipal fields of knowledge of other civilizations. Our acquisition policy will aim to fulfil these main objectives.

Briefly stated, I am very much impressed by your informative publication entitled "Al-Risala". Kindly send all back volumes to 1984. I hope that it would be useful to our readers. I shall be grateful if you would send the above mentioned publication to our library. Please also include the name of our Centre in your mailing list, so that we may receive your publications/periodical regularly.

Yours faithfully

Dr Zaid al-Husain
Director General



RIYADH 11411 — SAUDI ARABIA — P.O. BOX 352 — CABLE: HADARA — TEL.: 4652255 — TELEX: 205470 HADARA

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔

الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متنوع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مستول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

الرسالہ

کیسٹ

الرسالہ کیسٹ کی روانگی انشاءاللہ یکم جون سے شروع ہوگی

انفرادی خریدار اطلاع بھیج کر جلد اپنی خریداری درج کرادیں۔

جو حضرات اس کی ایجنسی لینا چاہیں

وہ بھی اپنی مطلوبہ تعداد سے مطلع فرمائیں۔

الرسالہ کیسٹ کی ایجنسی کم از کم پانچ کیسٹوں پر دی جائے گی۔

کمیشن :

۲۵ کیسٹ تک — ۲۰ فی صد

۲۵ کیسٹ سے زیادہ — ۲۵ فی صد

(ہدیہ فی کیسٹ ۲۵ روپیہ)

الرسالہ کیسٹ

سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

Regd. No. D(SE) 243
Regd. R.N. No. 28822/76

May 1985
Number 102

AL-RISALA MONTHLY
C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128

Rs 3.00